www.novelsclubb.com
دل کے یہ موسم
فاخرہ جبیں
Pdf available at
www novelsclubb com
FB INSTA
novelsclubb

السلام علیکم

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔ تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک، انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP:

دل کے یہ موسم

از

فاخرہ جبیں

www.novelsclubb.com

فاخرہ جبیں

دل کے یہ موسم

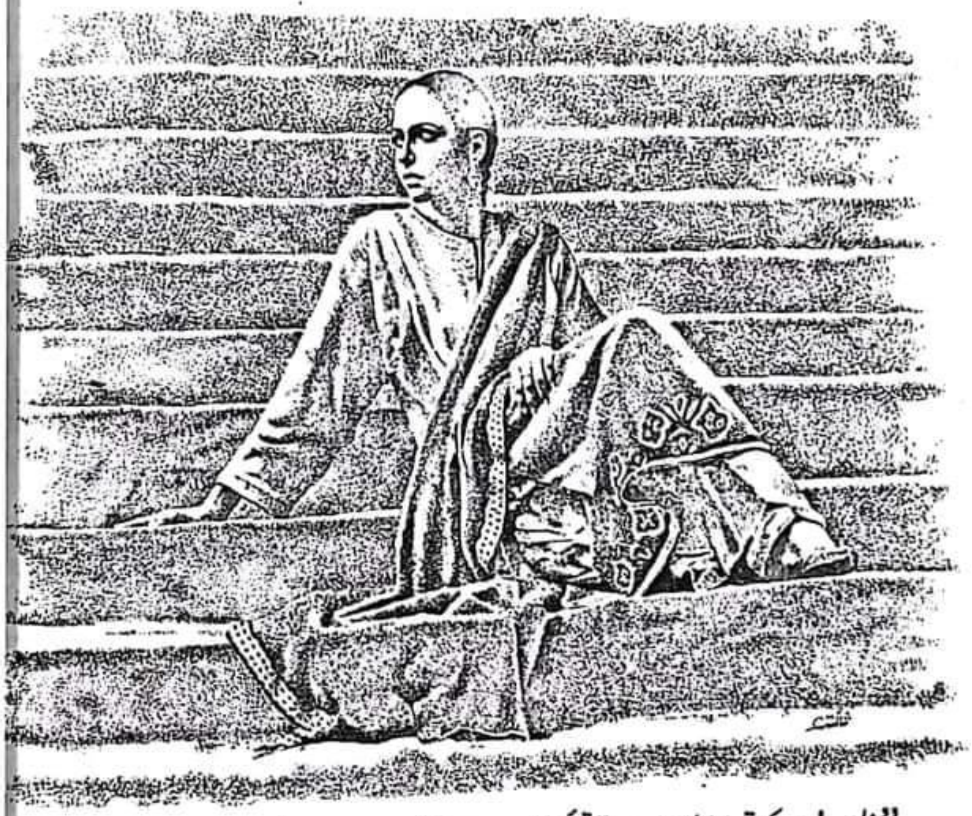

"ثانیہ! جمعہ کو تمہارا نکاح ہے۔" تائی اماں نے بہت اچانک کہا تھا۔

برآمدے کی سیڑھیوں سے صابن کا جھاگ ہٹاتے ہوئے جینا کے ہاتھ سے جھاڑو چھوٹ گئی تھی۔ آلو چھیلتی ہوئی روبی چھری روک کر نا سمجھی کے عالم میں ماں کو دیکھنے لگی تھی اور خود ثانیہ واشنگ مشین کا سوئچ آف کرتے ہوئے اپنی جگہ ساکت سی رہ گئی تھی۔

"تم آج بازار جاکر کچھ ضروری چیزیں لے آنا۔" ثانیہ نے پلٹ کر دیکھا' تائی اماں نے پالک کے گلے سڑے پتے اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈالے اور کٹی ہوئی پالک کی ٹوکری اٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔ ثانیہ کی نگاہیں ڈسٹ بن میں جم کر رہ گئی تھیں۔

100

مکمل ناول

ڈسٹ بن۔۔۔ کوڑے دان۔۔۔ جس میں گلی سڑی اور تعفن زدہ چیزیں نہایت کراہیت کے ساتھ پھینک دی جاتی ہیں۔ اسے اپنا وجود کوڑے دان میں گلتا سڑتا محسوس ہوا تھا۔

"جمعہ کو تمہارا نکاح ہے۔ یہی کہا ناں اماں نے؟" روبی کو بھی غالباً" اس کی طرح اپنی سماعتوں پر شبہ ہوا

"باجی جی ۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ نہ کوئی بات چیت کا سلسلہ ۔۔۔ نہ منگنی شنگنی ۔۔۔ سیدھا سادا نکاح اور وہ بھی جمعہ کو۔" جینا نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی انگلیوں کو گنا۔

"اور جمعہ میں بھی تو بس چار دن باقی ہیں۔" اس نے جی بھر کے پریشان ہوتے ہوئے بغور گم صم کھڑی

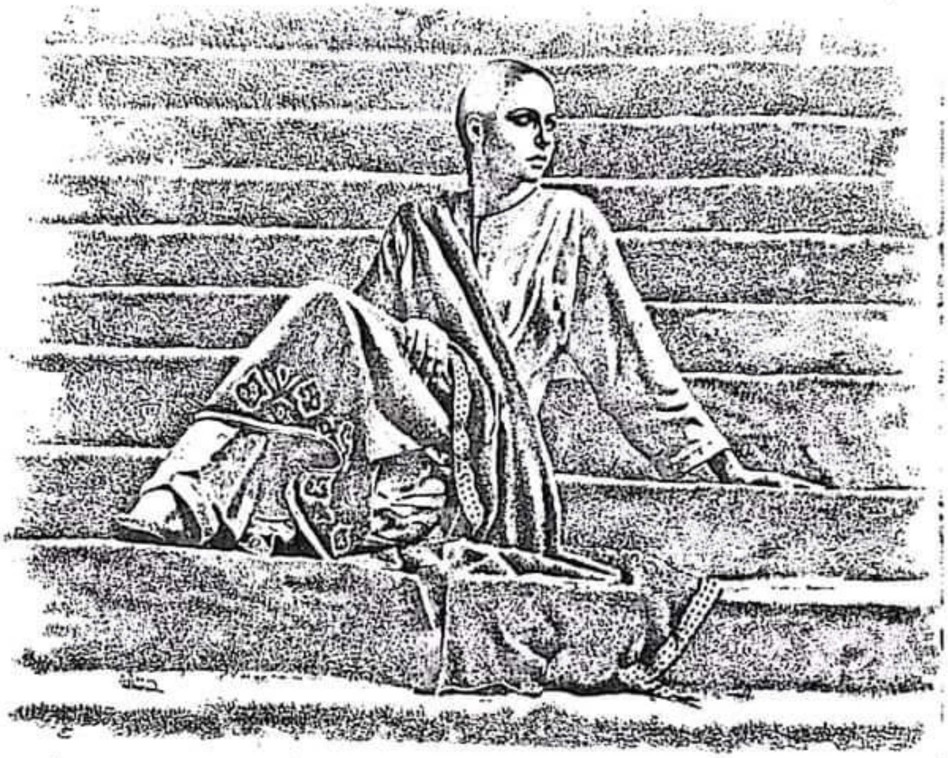

تھا۔

"تم ٹھہرو۔ میں ابھی ٹھیک طرح سے معلوم کر کے آتی ہوں۔" وہ اس کے پاس سے نکلتی چلی گئی۔ تب ہی اسے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ جینا متفکر چہرہ لیے اس کے نہایت قریب کھڑی تھی۔

ثانیہ کو دیکھا اور فی الحال اسے اپنی رائے دینے پر آمادہ نہ ہوتے دیکھ کر وہ اصل صورتحال کی جانچ پڑتال کے لیے روبی کے پیچھے بھاگ گئی۔ ثانیہ نے سہمی سہمی نظروں سے باورچی خانے کے خالی دروازے کو دیکھا اور ٹوٹتی ہوئی سانسوں کے ساتھ سہارے کے لیے تنگی ستون سے سر ٹکا دیا۔ کتنے ہی لمحے خود کو دلاسا

101

دینے کے بعد وہ سیدھی ہوئی۔ جینا پانی کا پائپ یونہی پھینک کر چلی گئی تھی۔ بھل بھل بہتے پانی نے پورے برآمدے اور سیڑھیوں کو بھگو دیا تھا اور سیڑھیوں کے سامنے بنی کیاریاں اسی پانی سے بھری گئی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر پانی بند کیا۔ واشنگ مشین کا سوئچ آف کر کے اسے برآمدے کے ساتھ بنے اسٹور میں رکھا اور جھاڑو اٹھا کر برآمدے کا پانی صاف کرنے لگی۔ اسے اپنے ہاتھ کپکپاتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ خود کو نارمل رکھنے کی شعوری کوشش کر رہی تھی اور جب یہ ممکن نہ ہو سکا تو وہ جھاڑو پھینک کر سیدھی کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر باورچی خانے کے خالی دروازے کو دیکھا اور پھر چلتی ہوئی دروازے کے باہر آ رکی۔ تائی اماں کی آواز یہاں بھی بخوبی سنائی دے رہی تھی۔ اسے اندر جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

"اچھے خاصے کھاتے پیتے خوشحال لوگ ہیں۔ اس کے تو عیش ہو جائیں گے۔"

"لیکن اماں، اتنی جلدی کیوں؟ ابھی تو ہم لوگوں نے کچھ تیاری بھی۔۔۔" روبی نے سوال اٹھایا مگر تائی اماں نے تلخ لہجے میں اسے ٹوک دیا۔

"تیاری کیسی؟ لاکھوں کروڑوں کا مال نہیں چھوڑا اس کے اماں باوا نے کہ ٹرک بھر بھر کے جہیز کے بھجواؤں گی۔ تم بازار جا کر دو چار بنے بنائے سوٹ لے آنا۔ زیور وہ لوگ خود ہی لائیں گے۔"

اس سے پہلے کہ روبی مزید استفسار کرتی اور تائی اماں اسے مزید جلی کٹی سناتیں وہ وہاں سے چلی آئی تھی اور کمرے میں آ کر اپنی چارپائی پر گر سی گئی تھی۔

وجود میں کچھ ایسا تھا جو ٹوٹ رہا تھا۔ آنکھیں سمندر بہا دینے کو تیار تھیں مگر اس وقت وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر بازو رکھ لیا اور دھیرے دھیرے اپنے اندر کی ثانیہ کو تھپکنے لگی جس کی سسکیاں کرب بن کر اسے نڈھال کر رہی تھیں۔ جینا کمرے میں آئی تو اسے اس حالت میں پڑے دیکھ کر طویل سانس لے کر رہ گئی۔

وہ ابھی تک ان ہی کپڑوں میں تھی جو کپڑوں کی دھلائی کے درمیان آدھے سے زیادہ بھیگ چکے تھے۔ پہلی نظر میں جینا کو یہ ہی شبہ ہوا تھا کہ شاید وہ سو رہی ہے لیکن اس کے تسلسل ہلتے پاؤں نے جینا کے شبہے کو رد کر دیا تھا۔

"باجی جی۔۔۔" جینا کے لہجے میں ہلکا ہلکا جوش نمایاں تھا۔ اس کی آواز پر ثانیہ کا ہلتا ہوا پاؤں ساکت ہو گیا تھا لیکن انداز میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"ثانیہ باجی۔۔۔ میں نے سارا پتا کر لیا ہے جی۔ آپ کی تو بڑی اچھی جگہ شادی ہونے والی ہے۔" جینا نے فوراً آگے بڑھ کر ثانیہ کا بازو ہٹایا تو وہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی۔ جینا کافی خوش نظر آ رہی تھی۔

"پتا ہے اماں جی نے آپ کی تصویر لڑکے والوں کو دکھائی تھی۔ انہوں نے فوراً ہی آپ کو پسند کر لیا۔ لڑکے کو آپ کے تایا دیکھ آئے تھے۔ ان کا گھر تو ایسا ہے جی کہ دیکھو تو آنکھیں کھل جائیں۔ کئی کئی فیکٹریاں ہیں ان کی۔" جینا یوں بتا رہی تھی گویا سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی ہو۔

"اگر اتنے ہی امیر کبیر ہیں تو یہاں اس پانچ مرلے کے مکان تک کیوں آ گئے؟ اور بالفرض آ بھی گئے تو تایا، تائی مجھ پر اتنے مہربان کب سے ہو گئے کہ روبی کے بجائے مجھے اس جنت کے مزے لوٹنے کے لیے بھیج رہے ہیں؟" وہ بری طرح الجھ رہی تھی مگر جینا سے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا سو چپ چاپ اس کی بچکانہ باتیں سنتی رہی۔

"ہائے باجی! کتنا مزہ آئے گا۔ میں نے ابھی پچھلے دنوں ہی اپنی سہیلی سے نیا پراندہ بنوایا ہے۔ بس اس میں گھنگھرو لگانے رہتے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ابھی تو چار دن باقی ہیں۔ پتا نہیں ڈھولک بجائیں گے یا پرات۔۔۔ ڈھولک تو مجھے بجانی نہیں آتی۔ چلو میں اپنے خصے کی پرات بجا لوں گی۔"

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

ثانیہ نے قدرے جھنجلا کر جینا کو دیکھا جو کسی خودکار مشین کی طرح کھٹا کھٹ اپنے منصوبوں کا ڈھیر لگاتی جارہی تھی۔

"ہائے باجی۔ آپ نے اس طرح منہ کیوں بنایا ہوا ہے؟ اچھا۔۔۔ اچھا۔ سمجھ گئی۔۔۔ دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔" جینا چہکی تو وہ بری طرح چڑ گئی۔

"جینا۔۔۔! خدا کا واسطہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوجاؤ۔"

"لو۔۔۔ ایویں خاموش ہوجاؤں۔ اتنا خوشی کا موقع ہے۔۔۔ ہائے باجی۔۔۔ آپ بڑی قسمت والی ہیں۔ اتنی جلدی شادی ہوجائے گی آپ کی اور وہ بھی اتنے اچھے گھر میں۔ ایک ہم ہیں۔۔۔ ہک ہا۔۔۔ بس اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں اب تو۔۔۔"

جینا کو بڑی شدت سے اپنی بدقسمتی کا احساس ہورہا تھا۔ ثانیہ اس کے چہرے پر چھائی حسرتوں کو دیکھتی رہ گئی۔

یہ ہی بات تو ہولائے دے رہی ہے جینا! ایسی قسمت والی کہاں سے ہوگئی میں؟ آج تک جو بھی طلب کیا ہے۔۔۔ نہیں ملا۔ اب بن چاہے، بن مانگے مل رہا ہے تو کیوں؟ انجانے میں کون سی نیکی سرزد ہوگئی کہ سب ہی خدا مجھ پر مہربان ہونے لگے۔ وہ جو آسمانوں پر ہے اور وہ بھی جو زمین پر بن بیٹھے ہیں۔ اسے شکوہ کرنے کی عادت نہیں تھی سو چپ چاپ بستر کی چادر سے نادیدہ گرد جھاڑتی رہی۔

"ثانیہ! عاطف آنے والا ہوگا۔ تم روٹیاں پکالو۔" تائی اماں کی آواز گونجی تو وہ بری طرح جھنجلا گئی۔

"اف یہ روز کے دھندے۔۔۔ معلوم نہیں کب جان چھوٹے گی ان سے۔"

"باجی! آپ رہنے دیں۔ میں روٹیاں پکالیتی ہوں۔ آپ تو ویسے بھی تھک گئی ہوں گی۔ ابھی تو اتنے ڈھیر سارے کپڑے دھوئے ہیں۔" جینا نے اس کے چہرے پر پھیلی تھکن اور بیزاری دیکھ کر کہا اور پھر فوراً ہی اٹھ گئی۔

"تھینک یو جینا۔" اس نے تشکرانہ انداز میں جینا سے کہا اور پھر دکھتے ہوئے سر کو تکیے پر گرادیا اور سوچ کے دھاگے ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے میں الجھنے لگے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب اتنی اچانک کیوں اور کیسے ہورہا ہے۔ تائی اماں تو ان دنوں روبی کے رشتے کے لیے سرگرداں تھیں۔ پھر روبی کے بجائے اس کی رخصتی کا پروگرام کیسے بن گیا۔ وہ درحقیقت الجھ کر رہ گئی تھی۔

بیس سال میں کوئی لمحہ بھی تو ایسا نہیں تھا جب اس نے صرف اور صرف اپنے بارے میں سوچا ہو بلکہ اس گھر میں اسے اس قابل رہنے ہی نہ دیا گیا تھا کہ وہ اپنے لیے کچھ اچھا یا برا سوچ سکتی۔ اسے تو بس حکم ماننے کا درس دیا گیا تھا اور ان بیس سالوں میں اس نے ایک بے دام غلام کی مانند اس درس پر تندہی سے عمل کیا تھا اور شاید اسی وجہ سے اس کی حیثیت اس گھر میں جینا سے بھی کمتر ہوکر رہ گئی تھی۔

تایا ابا کا حکم چلتا تھا تو اسی پر، تائی اماں کی ڈانٹ ڈپٹ، جھڑکیاں سنتی تھی تو صرف ثانیہ، غلطی کی معافی اور کسی بھی عمل کی وضاحت کی اسے اجازت نہ تھی۔ فروا آپی اور روبی کالج سے واپس آتیں تو ثانیہ ان کی خدمت گزاری کے لیے پہلے سے وہاں موجود ہوتی۔ عاطف کی ہر بدتمیزی برداشت کرنے اور شکایت نہ لگانے کا فریضہ بھی اسے ہی انجام دینا ہوتا تھا۔

اور یہ سب کرتے کرتے اس کے پاس اتنا وقت ہی نہ بچتا تھا کہ وہ اپنے لیے کچھ سوچتی۔ کوئی ننھے منے خواب پلکوں پر روشن کرتی۔ آتی بہاروں کا سندیسہ سنتی یا جاتی خزاؤں کی آہٹ پر کان دھرتی۔ اس نے تو کبھی خود کو اس قابل بھی نہ سمجھا تھا کہ وہ چودھویں کے چاند کی فسوں خیز چاندنی کو محسوس کرسکے۔ اس نے آسمان پر بکھرے ستاروں کو کبھی نظر بھر کے دیکھا بھی نہیں تھا۔ رات گئے اپنے تھکن سے چور نڈھال وجود کو بستر پر گراتی تو اس کے لبوں سے ایک ہی دعا نکلتی تھی کہ خدا کرے وہ مرجائے۔ اسے اپنی زندگی سے جو بد سے بدتر ہوتی چلی جارہی تھی، سخت نفرت تھی۔

103

وہ جینا نہیں چاہتی تھی۔ کبھی کبھار اس کی بے بسی اپنی انتہاؤں پر پہنچ کر بغاوت میں ڈھلنے لگتی تو اسے لگتا وہ ایک پل میں سب کو تہس نہس کر دے گی۔ مگر یہ باغی پن تایا کی آنکھوں سے چھلکتی سرخی اور تائی کے طعنے اور طنز و تمسخر کے سامنے دم توڑ جاتا۔

تائی اپنی انگلیوں پر گنتے ہوئے ایک ایک احسان جتانے لگتیں جو ان بیس سالوں میں انہوں نے اس پر کیے تھے۔ اس کی ساری سرکشی ساری بغاوت، ساری جرات لمحوں میں غائب ہو جاتی اور وہ — دونوں ہاتھ باندھے ایک بار پھر حکم کی غلام بن جاتی۔ ہاں، ایسا نہ ہوتا اگر وہ اندر سے مضبوط ہوتی اور اس کی ذات کی کمزوری ہی تھی جو ہر مقام پر اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیتی تھی۔

بچپن سے ہی اس کی شخصیت کو اس طرح مسخ کیا گیا تھا کہ اب اس کی زبان اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔ اس میں سر اٹھا کر چلنے کی ہمت نہ رہی تھی۔ اس نے بہت کچھ چپ چاپ سہنا سیکھ لیا تھا۔ اپنی ڈور دوسروں کے ہاتھ میں تھما دی تھی اور اب اس کا ہر عمل اس ہاتھ کی حرکت کا مطیع تھا۔

اور اب یہ ایک نیا فیصلہ اس کے سامنے تھا جس پر ہمیشہ کی طرح اسے نہ اعتراض کرنا تھا نہ پس و پیش سے کام لینا تھا۔ اسے تو عمل کرنا تھا صرف عمل، ہمیشہ کی طرح۔

شام کو روبی نے اسے مارکیٹ چلنے کے لیے کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ روبی کو اس کے انکار پر قدرے حیرت ہوئی تھی۔ اور جب اس نے ثانیہ کے انکار کو شرم اور جھجک پر محمول کرتے ہوئے دوبارہ اسے چلنے کو کہا تو ثانیہ نے بڑے اطمینان سے اسے کہہ دیا تھا۔

"میں مارکیٹ نہیں جانا چاہتی۔ تم میرے لیے جو بھی لے کر آؤ گی مجھے اس پر قطعاً" کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" روبی کو اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش محسوس ہوئی تھی جس پر وہ قدرے برہم بھی ہوئی مگر تائی اماں کے کہنے پر وہ جینا کو اپنے ساتھ مارکیٹ لے گئی تھی۔

چیزیں خریدنے میں اسے کوئی زیادہ دقت پیش نہیں آئی تھی۔ اس کا اور ثانیہ کا قد و قامت تقریباً ایک سا تھا سو اس نے درمیانے درجے کے چار عدد سوٹ، دو جوڑی جوتوں کی اور ایک ہلکا سا سونے کا سیٹ لیا تھا۔ جینا کی پرزور فرمائش پر اس نے منہ بناتے ہوئے کانچ کی چوڑیوں کا ایک سیٹ بھی ثانیہ کے لیے لے لیا تھا تاکہ وہ نکاح کے روز پہن سکے۔ یہ سب چیزیں خرید کر وہ گھر پہنچی تو اماں نے چیزیں دیکھتے ہی منہ بنا لیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس نے ان چیزوں پر ضرورت سے زیادہ روپے خرچ کر دیے ہیں۔ ان کی بات سن کر روبی بے طرح چڑ گئی تھی۔

"کیا ہوا اماں! اگر چار پیسے زیادہ لگ گئے۔ اس کے سسرال والوں کا مال تھا۔ آپ کے پلے سے تو کچھ بھی خرچ نہیں ہوا ناں؟" تلخی سے کہتے ہوئے روبی نے ثانیہ کی آنکھ سے پانی چھلکتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

کھانا لگانے کے بعد وہ کچن میں گئی تو دوبارہ واپس نہیں آئی تھی۔ حتیٰ کہ کھانے کے برتن بھی روبی کو ہی اٹھانے پڑے تھے۔ اس کا موڈ آج ویسے ہی بہت خراب تھا۔ بڑبڑاتے ہوئے اس نے تمام دھونے والے برتن یونہی سنک میں ڈال دیے اور کچن کا دروازہ بند کر کے ثانیہ کے کمرے کی طرف آ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ ثانیہ یقیناً" اپنے لیے لائی گئی چیزیں دیکھ رہی ہو گی۔ لیکن جب وہ کمرے کا دروازہ کھولنے لگی تو معلوم ہوا کہ دروازہ اندر سے بند تھا۔

اس نے ادھ کھلی کھڑکی سے اندر جھانکا تو لائٹ بند تھی اور ثانیہ منہ سر لپیٹے غالباً" سو رہی تھی۔ وہ پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف آ گئی۔ لاؤنج سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ شاپنگ کا سامان جوں کا توں لاؤنج کے صوفے پر پڑا تھا۔ وہ پاؤں پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں آئی اور دھاڑ سے دروازہ بند کر لیا۔ اسے اس بات پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا کہ ثانیہ نے اس کی خریدی گئی چیزوں پر ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

روبی ایک لاپروا اور لاابالی قسم کی لڑکی تھی اور وہ یقیناً" اس بے بس اور معصوم لڑکی کی دلی کیفیات

جاننے سے قاصر تھی جس نے اسے مزید پستی میں دھکیل دیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

دنیا درد نہ جانے امڑی
دل سے دور دراز
دل سے دور دراز بسے ہے
دنیا دور دراز
اشک لہو میں گھل مل جائیں
سینہ سسک سسک سہلائیں
آہیں بے آواز
دور دور تک روح میں گونجیں
خاموشی کے ساز
جانے کس نقطے پر جاکر
کھلے غموں کا راز
ابھی تو ہے آغاز نی امڑی
ابھی تو ہے آغاز
دنیا درد نہ جانے امڑی
دل سے دور دراز

رات سیاہ پڑ چکی تھی۔ ثانیہ کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور اس کی نظریں صحن میں کسی غیر مرئی نقطے پر جم کے رہ گئی تھیں۔ لیموں کے پیڑ کے عقب سے جھانکتا چاند بہت زرد اور اداس لگ رہا تھا۔ پورا صحن اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف صحن کی داہنی دیوار تھی جو سلگتی چاندنی کی زد میں نیم روشن لگ رہی تھی۔ اس کے کمرے کی کھلی کھڑکی سے نکلنے والی روشنی نے صحن کے عین وسط میں ایک راستہ سا بنا دیا تھا۔

"میاؤں۔۔۔۔" چھت پر جانے والی سیڑھیوں سے اترتی مانو کی کانچ جیسی آنکھیں اندھیرے میں چمکی تھیں اور اس کی "میاؤں" نے صحن میں بکھری خاموشی کی سپاٹ چادر پر نادیدہ سی شکنیں بکھیر دی تھیں۔ مانو نے برآمدے کے ستون کے پاس رک کر ایک لمحے کے لیے اداس اور مضمحل سی ثانیہ کو دیکھا اور پھر لمبی چھلانگ لگا کر برآمدے کے شیڈ پر چڑھ گئی۔

وہ خبطی سی دیوانی سی
ایک خبطی سی لڑکی کی کہانی
آسیہ سلیم قریشی کا ایک ایسا ناول جو خواتین ڈائجسٹ میں قسط وار چھپا اور بے حد مقبول ہوا آج بھی ہر لڑکی، ہر خاتون یہ ناول پڑھنا چاہتی ہے
اب کتابی صورت میں چھپ کر تیار ہے
مجلد، خوبصورت سرورق، قیمت 300 روپے
خواتین ڈائجسٹ
اردو بازار کراچی
ملنے کا پتا
• مکتبۂ عمران ڈائجسٹ اردو بازار کراچی
• لاہور اکیڈمی، 205 سرکلر روڈ بیرون اردو بازار، لاہور

ثانیہ نے ایک طویل سانس لے کر بازوؤں میں اپنا چہرہ چھپالیا۔ آج اس گھر میں اس کی آخری رات تھی۔ کل اس کی رخصتی تھی۔ گویا آج اس کی مہندی کی رسم ہونی چاہیے تھی اور جینا نے تائی اماں سے کتنا اصرار کیا تھا کہ اگر محلے میں سے کسی کو دعوت نہیں دینی تو وہ اکیلی ہی پرات بجاکر گانا وانا گالے گی مگر جواباً تائی اماں نے اسے ایسی جھاڑ پلائی تھی کہ بے چاری ہونٹ کاٹتی، آنسو پیتی وقت سے پہلے ہی اپنے گھر چلی گئی تھی۔ روبی کو بھی ماں کا رویہ ناگوار تو لگا مگر ان کی خفگی کے ڈر سے چپکی بیٹھی رہی۔ اور خود ثانیہ۔۔۔ اس کی نظروں میں فروا آپی کی مہندی کا دن گھوم رہا تھا۔ قریبی رشتے دار تو مایوں پر ہی جمع ہو گئے تھے جو باقی تھے وہ بھی مہندی کے دن آپہنچے تھے۔ خوب رونق اور ہنگامہ مچا ہوا تھا گھر میں۔ وہ کام کر کر کے ہلکان ہو گئی تھی مگر اس کے باوجود خوش تھی۔ شادی کی رسموں میں وہ بڑھ چڑھ کر تو حصہ نہیں لے سکتی تھی مگر بہرحال اس نے ہر رسم کو دیکھا ضرور تھا۔

فروا آپی کو پیلا جوڑا پہنایا گیا تھا۔ پھولوں کے ہار ڈالے گئے تھے۔ کلائیاں کانچ کی سبز اور پیلی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ سات سہاگنوں نے ان کی ہتھیلیوں پر مہندی سجائی تھی۔ ڈھیروں گیت گائے تھے۔ ڈھولک بجی تھی۔

اور آج اس کی کوری ہتھیلیاں خود بخود اس کے سامنے پھیل گئیں جہاں لکیریں بہت زیادہ تھیں مگر رنگ نہیں تھا۔ سہاگ کی مہندی کی خوشبو نہیں تھی۔ اس کی کلائیاں سونی تھیں۔ سماعتیں الوداعی گیت سننے کی تمنائی تھیں مگر اس کے آس پاس کچھ بھی تو ایسا نہ تھا جو اس کی خواہشات کی تسکین بن کر رگِ جاں کو آسودہ کر دیتا۔

دروازے کے پاس ہلکا سا کھٹکا ہوا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور پھر اندر آتی جینا کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"جینا تم۔۔۔؟ تم ابھی تک گئیں نہیں!" وہ جانتی تھی جینا سات بجے کام ختم کر کے ہی گھر چلی جایا کرتی تھی۔

"میں گھر سے ہی آرہی ہوں ثانیہ باجی۔" اس نے دوپٹے کے نیچے سے مٹی کا پیالہ باہر نکالتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ہے؟" ثانیہ کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر کے اس کی طرف پلٹی۔

"وہ۔۔۔ باجی جی۔۔۔ میں مہندی گھول کر لائی ہوں۔" جینا نے قدرے جھجکتے ہوئے بتایا تو وہ چند لمحے کے لیے خاموش سی کھڑی رہ گئی۔

"مجھے پتا تھا اماں جی نے مہندی لگانے پر بھی ڈانٹنا تھا اسی لیے میں اپنے گھر سے ہی لے کر آئی ہوں۔ آپ یہاں بیٹھیں باجی۔۔۔ میں آپ کے مہندی لگاتی ہوں۔ سادگی سے نکاح کرنا ہو تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کوئی رسم ہی نہ کی جائے۔" اس نے ثانیہ کو پکڑ کے چارپائی پر بٹھادیا اور خود مہندی کا پیالہ سنبھال کر اس کے سامنے جم گئی۔

"جینا۔۔۔! باقی سب لوگ۔۔۔" ثانیہ کو اپنی آواز میں نمی سی گھلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہیں جی۔ گیارہ، بارہ بجے سے پہلے کہاں اٹھنا ہے ان لوگوں نے۔" ثانیہ کا ہاتھ اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے اس نے بڑی بے دلی سے ان لوگوں کے متعلق بتایا۔

"باجی! مجھے ڈیزائن وغیرہ تو آتا نہیں، نہ ہی آپ کے "ان" کا نام معلوم ہے ورنہ وہی لکھ دیتی۔ لیکن مجھے لکھنا بھی کب آتا ہے آپ سے ہی لکھواتی۔" وہ خود ہی بول کر خود ہی ہنسنے لگی تھی۔ ثانیہ کوشش کے باوجود مسکرا نہ پائی۔ بس چپ چاپ اس سانولی سلونی، دبلی پتلی لڑکی کو دیکھتی رہی جس کے ساتھ اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا جو اس گھر کی صرف ملازمہ تھی مگر اس کے سارے شگن پورے کرنا چاہتی تھی۔

"لو باجی۔۔۔ میں نے تو بتاشہ بنادیا ہے۔" جینا کی آواز پر اس نے چونک کر دیکھا۔ صاف شفاف ہتھیلی کے عین وسط میں جینا نے گول دائرہ سا بنا کر مہندی لگادی تھی اور اب انگلیوں کی پوروں پر مہندی کا لیپ کر رہی تھی۔ ایک دھیمی سی مسکراہٹ ثانیہ کے

لبوں پر پھیلی اور پھر معدوم ہو گئی۔

گورے گورے ہاتھوں پہ لال لال مہندی
گورے گورے......

جینا نے بڑی شرارت سے اسے دیکھا اور دھیمے دھیمے گنگنانے لگی۔

"باجی آپ بھی گاؤ ناں۔"

میں تو چھوڑ چلی بابل کا دیس
پیا کا گھر پیارا لگے.....

جینا نے اب اس کا دوسرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس کی تنہا آواز کمرے کی خاموش سی اداسی میں گھلتی جارہی تھی۔ نجانے کیوں ثانیہ کا دل بھر آیا تو وہ اپنا سر گھٹنوں پر رکھ کر اپنی سسکیاں روکنے لگی۔

میں تو چھوڑ چلی بابل کا دیس
پیا کا گھر پیارا لگے.....

"ثانیہ باجی! دیکھیں تو کیسی پیاری مہندی لگائی ہے میں نے۔" دوسرے ہاتھ پر الٹا سیدھا ڈیزائن بنانے کے بعد اس نے ثانیہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تو اس کا پورا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

"باجی!" جینا کو شک گزرا کہ وہ رو رہی ہے۔

"آپ رو رہی ہیں ناں۔" اس نے یکدم پریشان ہو کر مہندی کا پیالہ زمین پر رکھا اور خود ثانیہ کے نزدیک ہو کر اسے دلاسا دینے لگی۔

"روتی کیوں ہیں؟ یہ تو خوشی کا دن ہے باجی۔ اپنے گھر جاؤ گی تو اس جنجال پورے سے جان چھوٹے گی۔ مجھے پتا ہے آپ نے اس گھر میں بڑی مشکل اور تکلیف میں دن کاٹے ہیں۔ اللہ سوہنا سسرال میں آپ کو اتنی ہی خوشیاں دے گا۔ نہ روئیں باجی....." جینا کا اپنا دل بھی ہولے ہولے لرزنے لگا۔ آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

"مجھے پتا ہے آپ کو اپنے امی، ابو یاد آرہے ہوں گے۔ وہ ہوتے تو آج کچھ بھی ایسا نہ ہوتا۔ آپ بھی فروا باجی کی طرح دھوم دھام سے اس گھر سے رخصت ہوتیں۔ پر باجی! آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔ میں ہوں نا آپ کے پاس۔ میں ہوں ناں۔"

وہ ثانیہ کو اپنے ساتھ لگا کر خود بھی سسکنے لگی تھی اور ثانیہ کے دل کا سارا دکھ اس کی آنکھوں کے راستے بہہ نکلا تھا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو ملگجا سا اجالا ہر طرف پھیل رہا تھا۔ وہ فوراً ہی نماز پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وضو کرنے کے بعد وہ کمرے میں آئی تو سب سے پہلے ہاتھ خشک کر کے مہندی کو دیکھنے لگی۔ رات جاتے وقت جینا اسے تاکید کر گئی تھی۔

"باجی یہ شگنوں کی مہندی ہے۔ دھو کر مت اتارنا، سوکھ کر خود ہی اتر جائے گی۔" اس نے ایسا ہی کیا تھا اور اب خوب ہی رنگ چڑھا تھا مہندی کا۔ سپید ہتھیلی کے درمیان میں سرخ سرخ مہندی کا بتاشہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔

نماز پڑھنے کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو رنگ دار ہتھیلیاں ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ وہ جیسے سب ہی دعائیں بھول گئی۔ کتنی ہی دیر ہاتھوں پر نظریں جمی رہیں۔ پھر یونہی دعا کے خاتمے پر چہرے پر ہاتھ پھیرا تو مہندی کی خوشبو کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

"یااللہ!" اس کے دل سے کوئی بے آواز دعا نکلی تھی اور ہونٹ خود بخود رنگ دار ہتھیلیوں پر جم گئے تھے۔

"ثانیہ! ابھی تک اٹھی نہیں کیا؟" دروازے سے باہر تائی اماں کی آواز ابھری تو وہ چونک گئی۔

"اٹھ گئی ہوں تائی اماں۔" اس نے جواباً آواز لگائی اور پھر جائے نماز لپیٹ کر باہر آگئی۔ تائی اماں روبی کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے جینا کو کوس رہی تھیں جسے انہوں نے آج جلدی آنے کی تاکید کی تھی۔ ثانیہ سیدھی کچن میں آگئی۔ رات کے جھوٹے برتن سنک میں پڑے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے جھنجلا سی گئی۔

"مجال ہے جو روبی کی بچی کسی کام کو ہاتھ لگا لے۔" اس نے دل ہی دل میں روبی کو کوسا اور چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر برتنوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ابھی نل

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

کھولا ہی تھا جب روبی بے ترتیب حلیے کے ساتھ آدھی بند اور آدھی کھلی آنکھوں سمیت کچن میں وارد ہوئی۔ ثانیہ کو وہاں موجود دیکھ کر وہ چونکی اور پھر آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اس کے سوال پر ثانیہ نے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف حیرت سے دیکھا تو اسے اپنے سوال کے بے تکے پن کا شدید احساس ہوا۔

"میرا مطلب ہے، تم جا کر نہالو۔ یہ کام میں سنبھال لیتی ہوں۔" اس نے ثانیہ کو ایک طرف ہٹایا تو وہ چپ چاپ کچن سے باہر آگئی۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے دیکھا تایا عاطف کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑا رہے تھے۔

"غضب خدا کا۔ وہ لوگ پہنچنے والے ہوں گے اور یہاں صاحبزادے کی نیندیں ہی ختم نہیں ہو رہیں۔ ارے کوئی چائے پانی کا انتظام بھی کرنا ہے کہ نہیں۔ عاطف۔۔۔! ارے سن رہے ہو تم' اٹھ رہے ہو یا لگاؤں آکر دو جوتے۔"

تایا ہر معاملے میں بہت جلد حواس باختہ ہو جایا کرتے تھے اب بھی یہی حال تھا۔ وہ نہا کر باہر نکلی تو جینا آچکی تھی اور اب پانی کا پائپ نل سے لگائے بیٹھک دھو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرائی اور شڑاپ شڑاپ جھاڑو لگانے لگی۔ روبی اس کے پیچھے ہی کمرے میں چلی آئی اور ناقدانہ نظروں سے سراپا اسے دیکھنے لگی۔

"میرا خیال ہے بلکنگ کی ضرورت نہیں۔ تمہارے آئی بروز کا شیپ ویسے ہی بہت خوبصورت ہے۔ بلیچ تم کرتی نہیں ہو۔ ہاں البتہ میرے کمرے سے نیل فائلر لے کر ناخن فائل کر لو اور وہیں سے کوئی اچھی سی نیل پالش لے کر لگا لو۔ میں ذرا چائے کا بندوبست کر لوں۔" وہ سرسری سے انداز میں اسے ہدایت دے کر باہر نکل گئی۔ ثانیہ نے اس کے کمرے کے بجائے اپنی الماری سے نیل کٹر لیا اور آرام سے سارے ناخن تراش لیے۔

"لو باجی! بیٹھک تو میں نے خوب سنوار دی ہے۔ تازہ پھول لے کر آئی تھی درمیانی میز پر گلدان میں سجا دیئے ہیں۔" جینا گیلے پائنچے اڑستی اس کے کمرے میں آگئی۔

"ماشاءاللہ! باجی مہندی کا رنگ تو خوب چڑھا ہے۔ لائیں میں آپ کے بال سلجھا دوں۔ اتنے تو لمبے ہیں' سوکھنے میں بھی تو وقت لگے گا۔ دس بجے تو آجانا ہے انہوں نے۔" جینا نے اطلاع دی تو اس کی نظریں بے اختیار وال کلاک کی طرف اٹھ گئیں۔ صرف ایک گھنٹہ باقی تھا دس بجنے میں۔

اور پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا' اس کا دل انجانے خدشوں کے بوجھ سے لرزنے لگا۔ گھڑی کی سوئیوں کی ہر حرکت کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں الگ بے جان سے ہو رہے تھے۔ جینا کام کی غرض سے آتے جاتے اسے دیکھتی تو اس کی حالت کا خوب ہی مزہ لے لیتی۔

"ہائے باجی! آپ کے چہرے کا رنگ کیوں اڑتا جا رہا ہے؟ خیر خیر کوئی بات نہیں شادی والے دن سب لڑکیوں کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے۔ گھبرائی گھبرائی' بوکھلائی ہوئی' پریشان سی۔ بعد میں البتہ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔" جینا کی لن ترانیاں جاری تھیں جب روبی افراتفری میں اس کے کمرے میں بھاگی چلی آئی۔

"وہ لوگ آگئے ہیں۔"

جینا یہ سنتے ہی فٹ سے باہر بھاگ گئی اور ثانیہ ایک ناقابل بیان سی کیفیت میں گھری رہ گئی۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹیں سی دوڑنے لگیں۔ اسے اپنے وجود میں ہلکی سی کپکپاہٹ اور لرزش کا احساس ہو رہا تھا۔ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر وہ خود پر قابو پانے لگی۔ نجانے کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ تب ہی تائی اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔

"مولوی صاحب آرہے ہیں۔" بڑی سی چادر میں اس کے وجود کو چھپاتے ہوئے انہوں نے اطلاع دی تھی۔

ثانیہ کا دل ایک لمحے کے لیے پوری قوت سے سکڑ

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

کر پھیلا تھا اور رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

کمرے کی آرائش و زیبائش سے قطعاً" یہ تاثر نہیں مل رہا تھا کہ یہ کمرہ ایک نوبیاہتا دلہن کا ہے مگر اپنی تمام تر سادگی کے باوجود ثانیہ کو یہ کمرہ کسی مخمل کے ایک پر آسائش گوشے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ فرش پر بچھا ہوا سبز قالین ایسا نرم اور دبیز تھا کہ جس پر چلتے ہوئے پاؤں کے تلوؤں میں گدگدی سی ہونے لگتی تھی۔ بیڈ پر بچھی بے شکن چادر کی سرسراہٹیں کمرے کی مہیب خاموشی پر کتنی ہی نادیدہ لکیریں کندہ کر رہی تھیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر لٹکتے بھاری پردوں نے کمرے کے اندرونی ماحول کو بیرونی ماحول سے یکسر علیحدہ کر رکھا تھا۔ اس پر اے سی کی نم آلود خنکی تھی جو اسے جاڑے کی منہ زور ٹھنڈک کی طرح کپکپائے دے رہی تھی۔

اور کیسی عجیب بات تھی کہ یہ پر سکون ماحول اسے کسی بھی طمانیت خیز احساس سے دوچار کرنے کے بجائے اس کے اعصاب کو بری طرح متاثر کر رہا تھا۔ یونہی خالی خالی نظروں سے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نگاہیں سامنے رکھے ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے سے آئینے پر جا رکی تھیں جہاں اس کا اپنا ہی وجود تمام تر اجنبیت سمیت اس کے سامنے تھا۔ اس کے لیے اپنا آپ پہچاننا مشکل ہو رہا تھا اور ہوتا بھی کیوں ناں؟ اس کا تن تو ہمیشہ سے ہی اترن پہننے کا عادی رہا تھا۔ ایسا لباس جسے اس کا اصل مالک پہنتے پہنتے اکتا گیا ہو۔ بڑی فیاضی سے اس کے حوالے کر دیا جاتا تھا جبکہ آئینے میں نظر آنے والی لڑکی تو اس وقت بیش قیمت ریشمی لباس میں نظر آ رہی تھی جس پر بہت نفیس کڑھائی کی گئی تھی۔ جس کے ہاتھ میں سونے کی ایک انگوٹھی' گلے میں سونے کا ہلکا سا لاکٹ' کانوں میں ننھے منے ٹاپس' ناک میں سونے کی کیل اور کلائیوں میں سوٹ کی ہمرنگ چوڑیاں جگمگا رہی تھیں۔

یہ سارا حلیہ اس کا تھا وہ جو ایک نئی نویلی دلہن تھی اور جسے اب سے کچھ دیر پہلے اس گھر میں رخصت کر کے لایا گیا تھا اور اس کی تو رخصتی بھی یوں ہوئی تھی کہ اسے اب تک خود پر ترس آ رہا تھا کسی چہرے پر خوشی مسکراہٹ بن کر اتری تھی نہ دل میں کوئی امنگ ابھری تھی۔

گھر کے آنگن میں نہ بارات رونق بن کر اتری نہ گوشت اور زردے کی دیگیں چڑھائی گئیں۔ نہ شہنائی بجی نہ بینڈ باجے نے دھوم مچائی۔ بس چائے اور مٹھائی پر نکاح کی رسم ادا ہو گئی۔ ثانیہ نے رضامندی کے طور پر نکاح کے کاغذات پر دستخط کر دیے اور معاملہ ختم۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون نے نکاح کے بعد اس کے سر پر رسمی سا پیار دیا اور اسے ساتھ لے کر دہلیز سے باہر نکل آئی۔

وہ منتظر ہی رہی شاید تایا ابا باپ بن کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیں۔ شاید' شاید تائی اماں' ماں بن کر اسے اپنے سینے سے لگا لیں اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ شاید روبی اس کی جدائی کے خیال سے سسکیاں بھرتے ہوئے اس سے لپٹ جائے۔ شاید عاطف ایک بھائی کی طرح سب سے چوری چھپے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے آنکھیں سرخ کر ڈالے۔

مگر وہاں ہر آنکھ خشک تھی۔ سب ہی ہونٹ خاموش تھے۔ ایک جینا تھی جو اس کی رخصتی کے وقت گھر کے نجانے کس کونے میں جا چھپی تھی۔ نہ کسی نے اس کے سر پر قرآن کا سایہ کیا نہ کسی دعا سے سماعتیں لبریز ہوئیں۔ نہ اس کی آنکھوں نے نیر بہائے نہ الوداعی سسکیاں اس کے تعاقب میں آئیں۔ وہ اس گھر سے یوں رخصت ہوئی تھی جیسے کسی نومولود بچے کی میت بہت خاموشی سے گھر سے نکال دی جاتی ہے۔

"کیا ساری شادیاں ایسے ہی ہوتی ہیں؟" گاڑی کی عقبی سیٹ پر اسی ادھیڑ عمر خاتون کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس کے دماغ میں کیڑا سا کلبلایا جسے اس نے خود ہی بے دردی سے مسل ڈالا تھا۔

نہیں۔ ایسی شادیاں تو صرف ان کی ہوتی ہیں جن

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

کے سروں پر جنم دینے والوں کا سایہ نہ ہو۔ جن کے تایا' تائی نہ سوتیلے ہوں اور نہ زمانے بھر کے حریص و کینہ پرور۔ ایسی شادیاں تو صرف ان کی ہوتی ہیں جن کے نصیبوں پر سیاہ روشنائی سے جابجا بھٹے لگا دیے گئے ہوں۔

بے بسی' بے قدری' بد قسمتی اور کم مائیگی کے بھٹے۔ ایسی پکی اور گاڑھی سیاہی استعمال کی گئی ہے کہ نصیبوں کا سیاہ رنگ گھلتا ہے نہ ماند پڑتا ہے۔

سارا راستہ اس کی نظریں بھاگتی دوڑتی سڑک پر جمی رہیں یا گول گول گھومتے آسمان پر۔ دماغ میں ایک کے بعد ایک کیڑا کلبلاتا رہا۔ کچھ کو مسل دیا کچھ کو یونہی رہنے دیا۔ تب ہی گاڑی رک گئی۔ ساتھ بیٹھی خاتون نے اس کے بازو کو ہلکا سا چھو کر اترنے کا اشارا کیا تو وہ چپ چاپ گاڑی کے کھلے دروازے سے باہر آگئی تھی۔ اس کے عقب میں ایک اور گاڑی آکر رکی تھی۔ ٹھک ٹھک گاڑی کے دروازے بند ہوئے۔ کوئی ہوا کے جھونکے کی طرح اس کے پاس سے گزر کر راہداری کے کھلے دروازے سے غائب ہو گیا تھا اور اپنی خوشبو اس کے آس پاس چھوڑ گیا۔ پیچھے چند اور لوگوں کے قدموں اور باتوں کی ہلکی ہلکی آواز آتی رہی اور وہ خاتون اسے اپنی رہنمائی میں اس کمرے تک لا کے خود نجانے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔

اور اب کتنی ہی دیر سے وہ اس بھائیں بھائیں کرتے کمرے میں بیٹھی اپنے ہاتھ پر بکھری لکیروں کے جال میں الجھی ہوئی تھی۔ کہیں کوئی ترتیب نہ تھی۔ ہر ایک لکیر دوسری لکیر کو کاٹتی چلی جا رہی تھی۔ وہ گم صم سے انداز میں دونوں ہتھیلیاں سامنے پھیلائے ایک دوسرے سے موازنہ کرتی رہی اور وال کلاک کی بہت نفیس سی "ٹک' ٹک" کو سماعتوں میں محفوظ کرتی رہی۔

کون ہو گا وہ۔۔۔؟ اور کیسا ہو گا۔۔۔؟ ستر' اسی سالہ بوڑھا؟

دو تین بچوں کا باپ یا رنڈوا؟ ایک جھونپڑی سے اس عالیشان کوٹھی میں لایا گیا ہے مجھے' آخر کوئی تو وجہ ہو گی؟ ایک بڑا سا کیڑا دوبارہ اس کے دماغ میں رینگنے لگا تھا۔ تب ہی دروازہ کھلا وہ بری طرح چونک گئی۔ نظر بے اختیار دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ وہی ادھیڑ عمر خاتون کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ اسے جوں کا توں بیٹھے دیکھا تو بے اختیار ماتھے پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

"ارے بیٹی! تم اتنی دیر سے اسی جگہ ٹکی ہوئی ہو۔ ٹھیک طرح سے بیٹھ جاؤ ناں۔ اب تو یہی تمہارا گھر ہے۔ مجھ بڑھیا کی بھی عقل ماری گئی ہے۔ باورچی خانے میں کیا گئی تمہاری طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔" وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگیں اور ساتھ ہی ڈریسنگ ٹیبل پر آڑی ترچھی چیزوں کو ترتیب دینے لگیں۔

"پوری فوج ہے نوکروں کی اس گھر میں۔ مگر مجال ہے جو کوئی کام وقت پر ہو جائے۔ گھر کے افراد تو بس تین ہی ہیں۔ زارون اور ہارون میاں اور میں۔ ویسے تو میں بھی نوکر ہی ہوں۔ میاں جی گاؤں سے ملازمہ بنا کر ہی لائے تھے۔ ہارون کے دادا کی بات کر رہی ہوں میں۔" انہوں نے پلٹ کر میاں جی کے متعلق بتایا اور پھر پردے ہٹا کر کھڑکی کھول کر اس کے پاس آ بیٹھیں۔ کھڑکی سے عقبی لان کا منظر صاف دکھائی دینے لگا تھا۔

"ہارون اور زارون کو تو گودوں کھلایا ہے میں نے۔ ماں کی جگہ دے رکھی ہے انہوں نے۔ اب آگے تمہاری مرضی ہے ماں سمجھو یا ساس۔۔۔ میں تو تمہیں بیٹی بنا کر ہی رکھوں گی۔" انہوں نے بڑے پیار سے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ یہ اجنبی مگر محبت بھرا لمس اس کی روح تک اتر گیا تھا۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری ہو۔ اس گھر کی پہلی شادی ہے۔ جی تو چاہتا تھا دھوم دھڑکے سے جاتے اور خوب بنا سنوار کر لاتے تمہیں یہاں مگر ہارون میاں نے منع کر دیا اور ان کی بات بھلا کون ٹالے۔ خیر تم فکر نہیں کرنا۔ کپڑا' زیور' لتا بہت ہے اس گھر میں' جیسے جی چاہے پہننا اوڑھنا۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہو گی۔ اے لو میں تو باتوں میں ہی لگ گئی۔ کہنے تو یہ آئی تھی

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

کہ کھانا میز پر لگ گیا ہوگا تم بھی وہیں آجاؤ۔"

ثانیہ نے بے حد حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ وہ پہلے دن کی دلہن بھلا ڈائننگ ٹیبل پر جا کر کھائے گی۔ مگر وہ تو بے نیازی سے اپنی بات کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہہ ڈالا۔

"ارے بھوک کیسے نہیں ہے؟ اب تو دھوپ بھی ڈھل رہی ہے گھر میں تو صرف ناشتہ ہی کیا ہوگا ناں؟"

"نہیں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا کچھ کھانے کو۔" اس نے مرے مرے سے انداز میں بہانا بنا دیا۔

"کہیں تم ڈائننگ ٹیبل پر جانے سے تو نہیں جھجک رہیں۔ اگر ایسی بات ہے تو میں یہیں لے آتی ہوں۔" انہوں نے بڑی اپنائیت سے کہا اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی باہر نکل گئیں۔ ان کے جانے کے بعد اس نے پہلی بار یہاں کھل کر سانس لیا تھا۔ ان کی بات چیت سے اس کی جھجک قدرے دور ہو گئی تھی۔ اس لیے پہلے بیڈ پر ٹانگیں ذرا سیدھی کیں اور پھر نیچے اتر آئی۔

کمرے کی دائیں دیوار میں ایک دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے بہت آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ یہ غالباً "ڈریسنگ روم تھا۔ اس نے ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔ دوسرا دروازہ غالباً" باتھ روم کا تھا۔ تب ہی باتیں کرنے کی ہلکی سی آواز نے اسے چونکا دیا جو بیرونی دروازہ کھلا ہونے کے باعث کمرے میں آرہی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتے ہوئے دروازے تک آئی اور گردن باہر نکال کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ راہداری بالکل سنسان پڑی تھی۔ وہ دو قدم چل کر باہر نکل آئی۔ اس کے کمرے کے عین سامنے ایک دروازہ کھلا تھا جو غالباً" ڈرائینگ روم تھا۔ اس سے پرے ڈائننگ روم کا منظر بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس وقت دو ہی نفوس بیٹھے تھے۔ دونوں مرد تھے اور دونوں ہی بے حد خوبرو تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ یہ یقیناً" زارون اور ہارون تھے۔ "اور ان دونوں میں سے ایک "وہ" ہے مگر کون؟" اس نے آنکھیں پھیلا کر بڑے غور سے انہیں دیکھا گویا ان دونوں میں سے کسی ایک چہرے پر اپنا نام پڑھنا چاہتی ہو۔ ایک ثانیہ کے بالکل سامنے بیٹھا تھا دوسرے کی صرف دائیں سائیڈ نظر آرہی تھی۔ ثانیہ نے نوٹ کیا سامنے والا بے تحاشا اور بات بے بات مسکرا رہا تھا۔ کھانا بھی کم کھا رہا تھا۔ دوسرا بس کبھی کبھار مسکرا دیتا تھا اور زیادہ توجہ کھانے کی طرف ہی تھی۔ وہ سامنے والے کی نسبت خاصا سنجیدہ اور کم گو لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ان کا جائزہ لینے کے بعد ان کی باتوں پر بھی کان دھرتی قریب ہی کہیں قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً اسے پیشتر پلٹ کر اپنے کمرے میں گھس گئی تھی۔

آنے والی اماں وزیراں ہی تھیں۔ پیچھے ایک ملازم کھانے کی ٹرے اٹھائے ہوئے تھا۔ لمحوں میں پر تکلف کھانا اس کے سامنے لگا کر وہ واپس چلی گئیں۔

"کیا میں اکیلی ہی کھاؤں گی؟" دل میں ابھرتے سوال کو ہونٹوں پر لانے کی ہمت تھی نہ جرات۔ سو وہ خاموشی سے ایک ایک لقمہ حلق سے نیچے اتارنے لگی۔ کھانے کے بعد اماں وزیراں اسے آرام کرنے کا کہہ کر چلی گئی تھیں۔

"معلوم نہیں یہ سب اتنا عجیب سا کیوں لگ رہا ہے۔ شاید اس لیے کہ کچھ بھی معمول کے مطابق نہیں ہو رہا۔" نرم و گداز فوم پر کروٹیں بدلتے ہوئے اس نے سوچا تھا اور نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

کسی غیر مانوس احساس کے تحت ثانیہ کی آنکھ کھلی تو ایک لمبے چوڑے وجود کو خود پر جھکے دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ فوری طور پر اسے یہ سمجھنے میں بھی دشواری پیش آئی تھی کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟ جبکہ پاس کھڑا وہ شخص اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"تم مجھ سے ڈر گئیں؟ میں تو صرف تمہیں جگا رہا تھا۔" جس استحقاق بھرے انداز میں وہ کمرے میں کھڑا

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

تھا اور اب اس سے مخاطب تھا' ثانیہ سمجھ گئی تھی کہ یہ زارون کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ نکاح کے بعد کتنی ہی دیر تک اسے اس نام کی بازگشت سنائی دیتی رہی تھی اور اب بالآخر وہ سامنے آہی گیا تھا۔

وہ ابھی بھی اس کے سر پر سوار تھا۔ ثانیہ نے مختل ہوتے حواسوں کے ساتھ سرہانے پڑا دوپٹہ اٹھا کر اوڑھا اور اس کی طرف سے قدرے رخ موڑ لیا۔ فوری طور پر اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ سو آنکھیں بند کر کے اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالنے میں لگ گئی۔ قیمتی مردانہ پرفیوم کی مہک اس کے آس پاس منڈلاتے ہوئے اسے مزید بوکھلانے لگی تھی۔ زارون نہایت اطمینان سے چلتا ہوا دیوار گیر الماری کی طرف بڑھ گیا تھا۔ الماری کھول کر اس میں سے کوئی چیز نکالنے کے بعد وہ اس کی طرف پلٹا تھا۔

"چاکلیٹ کھاؤ گی؟"

ثانیہ کے لیے یہ پیشکش انتہائی غیر متوقع تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر ذرا کی ذرا اس کی طرف دیکھا۔ وہ چاکلیٹ کا ریپر کھولتے ہوئے اسی کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

"نہیں کھاؤ گی؟ اچھی بات ہے۔ اچھے بچے چاکلیٹ نہیں کھاتے۔ ویسے تو میں بھی اچھا بچہ ہوں مگر کبھی کبھی گندا بچہ بن جاتا ہوں۔ چاکلیٹ کھانے کے لیے ناں۔" وہ چاکلیٹ کھانے لگا۔ جبکہ ثانیہ کو اس کے بچکانہ مذاق سے کوفت ہونے لگی تھی۔ یہ کوئی وقت تو نہ تھا ایسا مذاق کرنے کا۔

"اوہو۔۔۔ میں نے تم سے اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔" چاکلیٹ کھا کر اس نے ریپر یونہی ہوا میں اچھالا اور دھم سے بیڈ پر آگرا۔ ثانیہ اپنی جگہ سمٹ سی گئی تھی۔

"ہیلو! مائی نیم از زارون۔" اس نے اپنا ہاتھ ثانیہ کے سامنے پھیلا دیا۔ ثانیہ نے چونک کر اسے دیکھا جو بڑی بے تکلفی سے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔ اس کی سرد ہوتی ہوئی پوریں خود بخود اس کی ہتھیلیوں میں گڑ گئیں۔ جانے کیوں زارون کو دیکھ کر اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہو رہا تھا جسے فی الحال وہ خود بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

"تم دلہن ہو ناں۔۔۔؟ میری دلہن۔۔۔۔۔!"

ثانیہ نے اس بار بغور اسے دیکھا تھا جو کہنیوں کے بل اوندھا لیٹا ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ سجائے بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس دیکھنے میں کوئی سرشاری' کوئی وارفتگی پنہاں نہیں تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں معصومیت اور سادگی تھی اور حد درجہ تھی۔

"میں بھائیان کے پاس گیا تھا' کہنے لگے جاؤ اپنی دلہن کو کمپنی دو۔ ارے تم سوچ کیا رہی ہو؟ ہاتھ بڑھاؤ ناں۔ میں تو تم سے دوستی کرنے آیا ہوں۔" اس نے خود ہی ثانیہ کا ہاتھ کھینچ کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور وہ جو ہکا بکا سی بیٹھی تھی ایک دم سٹپٹا گئی۔ فوری طور پر اپنا ہاتھ واپس کھینچنا چاہا وہ جھٹ سے سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ تم نے ہاتھوں کو کلر کیسے کیا ہے؟ اور یہ تم نے کیا ڈال رکھا ہے ہاتھوں میں؟" وہ اپنی آنکھوں میں بے پناہ اشتیاق سمیٹے اس کی کلائیوں میں پہنی کانچ کی چوڑیوں کو چھیڑنے لگا۔

"اماں وزیراں نے تو کبھی ایسا کام نہیں کیا۔ میں نے اور بھائیان نے بھی کبھی ہاتھوں کو کلر نہیں کیا۔ ہاں یہ اچھی لگ رہی ہیں۔ میں بھی اپنے ہاتھوں میں ڈالوں گا۔"

اس نے ایک دم خواہش ظاہر کی اور فوراً ہی اس کی کلائی سے چوڑیاں اتارنے لگا اور ثانیہ تو اس قدر پریشان و متعجب تھی کہ معمولی سی مزاحمت بھی نہ کر سکی۔ بس دم بخود سی سانس روکے' پھٹی پھٹی آنکھوں سے بس اسے دیکھے جا رہی تھی۔ ذہن اس لمحے کچھ سوچنے سے قاصر لگ رہا تھا۔

وہ لمبا چوڑا انتہائی خوبصورت نوجوان تھا مگر باتیں کرنے کا لہجہ و انداز۔۔۔ اس کی حرکات اسے ایک آٹھ دس سالہ بچہ ظاہر کر رہی تھیں۔

"کیا یہ کوئی مذاق ہے؟" اس نے نگاہوں میں اسے جانچا مگر وہاں مذاق کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو انتہائی سنجیدگی سے چوڑیوں کو اپنے ہاتھوں میں چڑھانے کی کوشش کر رہا تھا اور ظاہر ہے یہ ممکن تو نہ تھا۔ ذرا سی زور آزمائی سے کتنی ہی چوڑیاں ٹوٹ کر بیڈ کی چادر پر بکھر گئی تھیں۔ غالباً" کانچ کا کوئی ننھا منا ٹکڑا بھی اس کے ہاتھ میں گھس گیا تھا اسی لیے وہ تڑپ کر ہاتھ جھٹکتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اوہ ۔۔۔ نو ۔۔۔ خون ۔۔۔" اس نے بے حد صدمے کے عالم میں اپنے ہاتھ پر ابھرتے خون کے ننھے سے قطرے کو دیکھا اور جارحانہ تیوروں سے اسے گھورنے لگا۔

"تم ۔۔۔ تم بہت اسٹوپڈ دلہن ہو۔ ایڈیٹ۔ یہ دیکھو خون نکل آیا ہے میرے ہاتھ سے۔ اب میں تمہارے بھی خون نکال کر رہوں گا۔" اس نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑنی چاہی تو وہ فوراً ہی گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ چہرے کا رنگ یکدم ہی فق ہو گیا تھا۔

"چھوڑوں گا تو نہیں میں تمہیں۔" وہ اپنی پہلی کوشش میں ناکامی پر سخت جھنجلا کر اس پر جھپٹا تھا اور ثانیہ کے ہاتھ پاؤں یوں بے دم ہوئے کہ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ سرک سکی تھی۔ اور اس کی اسی بزدلی و بے بسی سے فائدہ اٹھا کر زارون نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اگلے ہی لمحے ایک ہی وار میں کئی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔

"اب مزہ آئے گا تمہیں۔" وہ بہت خوش ہوا تھا اپنی کامیابی پر اور ثانیہ کو اس بات میں کوئی شبہ نہ رہا تھا کہ وہ شخص ذہنی طور پر معذور تھا۔ اس یقین نے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹیں سی دوڑا دی تھیں۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کروایا اور بیڈ سے نیچے اتر آئی۔ جبکہ زارون بڑے خوش باش انداز میں ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ ثانیہ دم بخود سی کھڑی اسے باہر جاتے دیکھ رہی تھی۔

"دھوکا ۔۔۔" کوئی بجلی سی گری تھی اور اس کے دل و دماغ اور پورے وجود کو راکھ کر گئی تھی۔ بہت بڑا دھوکا دیا گیا تھا اسے مگر دھوکے باز تھا کون؟

اس کے اپنے جنہیں وہ چھوڑ کر آئی تھی یا وہ جو اسے اپنا بنا کر یہاں لائے تھے۔ اس کے وجود میں صحرا اگ آیا تھا اور حلق تک ریت بھر گئی تھی۔ سانس سینے میں گئی تھی تو وہیں کہیں اٹک کر رہ گئی تھی۔

"ہا ۔۔۔ ہا ۔۔۔ میں نے بھی دلہن کے خون نکال دیا۔" زارون باہر جا کر چکا تھا اور خون تو واقعی ہو گیا تھا ۔۔۔ اس کی آرزوؤں کا ۔۔۔ خوابوں کا ۔۔۔ خواہشوں کا ۔۔۔

اماں وزیراں زارون کی بات سن کر بوکھلا کر کمرے کی طرف بھاگیں اور کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئی تھیں۔

"ارے بیٹی ۔۔۔ کیا ہوا یہ؟" وہ لپک کر اس تک آئیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھنے لگیں۔ کلائی سے قطرہ قطرہ خون رس رہا تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ فکر کی بات یہ تھی کہ وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت و صامت کھڑی تھی۔ ایک دم چپ چاپ۔ بے حس و حرکت۔

"ثانیہ بیٹی ۔۔۔" انہوں نے دھیرے سے اس کا شانہ ہلایا تو وہ غائب دماغی سے انہیں دیکھے گئی۔

"نہیں ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا ۔۔۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔

"وہ ۔۔۔ وہ پاگل ہے ناں ۔۔۔؟ اسی لیے میری شادی اس سے ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔" وہ لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے دیوار سے جا لگی تھی۔ اماں وزیراں اس کی حالت دیکھ کر ایک دم گھبرا گئیں۔

"اے بٹی! کیا ہو رہا ہے تمہیں؟ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ ارے ہارون ۔۔۔ ہارون میاں ۔۔۔" انہوں نے ایک ساتھ کتنی ہی آوازیں دے ڈالیں۔

"کیا بات ہے اماں؟ اور کیا ہو رہا ہے یہاں؟" ہارون نے قدرے برہم لہجے میں دروازے پر کھڑے کھڑے پوچھا مگر ثانیہ پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح چونک گئے تھے۔

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

سخت تشویش کے عالم میں وہ دو قدم آگے بڑھ آئے تھے۔

"کیا ہوا اسے؟" ثانیہ کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اماں سے پوچھا تھا۔

"بہت برا ہوا ہے ہارون میاں!۔ بہت برا۔ یہ بچی تو ہر بات سے بے خبر ہے۔ گھر والوں نے اسے کچھ بتلائے بغیر ہی۔۔۔" بوا کو اس معصوم پر بے تحاشا ترس آرہا تھا جو اب تک عالمِ بے یقینی میں گم صم کھڑی تھی۔

"اوہ گاڈ۔۔۔" یہ بات ہارون کے لیے بھی دکھ کا باعث تھی مگر فی الحال ثانیہ کی ظاہری حالت نے انہیں مزید کچھ سوچنے کا وقت نہیں دیا۔ ایسی صورت حال میں ثانیہ کا ردِ عمل اگرچہ شدید تھا مگر غیر مناسب ہرگز نہیں۔ اس کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی یقیناً" اسے ایسا ہی شاک پہنچتا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس کے سامنے آکھڑے ہوئے مگر ثانیہ جیسے ان کی آمد سے بالکل بے خبر تھی۔ اس کا رنگ دھلے لٹھے کی مانند خطرناک حد تک سفید ہو چکا تھا۔ آنکھیں حد درجہ خالی اور ویران تھیں۔

"ثانیہ۔۔۔!" اس کے نزدیک جاکر انہوں نے آہستگی سے پکارا مگر ثانیہ کا چہرہ بے تاثر ہی رہا۔ اس کا دوپٹہ نجانے کب پھسل کر قدموں میں جاگرا تھا۔ ہارون نے جھک کر دوپٹہ اٹھایا اور آہستگی سے اس کے شانے پر ڈال دیا۔ تب اس کی ساکت پتلیوں میں جنبش ہوئی اور پلکوں پر لرزش سی اتر آئی۔

"ثانیہ۔۔۔! تم ٹھیک تو ہو نا؟" انہوں نے اطمینان کرنا چاہا مگر وہ سختی سے ان کا ہاتھ جھٹک کر ان سے کئی قدم دور ہٹ گئی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ زور زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے حواسوں سے باہر لگ رہی تھی۔

"دھوکا ہوا ہے میرے ساتھ۔" وہ پوری قوت سے چیخی تھی۔

"آپ سب لوگوں نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ فریب دیا ہے مجھے۔"

"ثانیہ! ایسی بات نہیں ہے۔" ہارون نے اسے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے موقع نہیں دیا۔

"تم لوگوں نے میری غربت اور بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ میں ایک منٹ بھی یہاں نہیں ٹھہروں گی۔" وہ ہسٹریائی انداز میں دروازے کی طرف بھاگی تھی۔ مگر ہارون نے ایک لمحہ کی بھی دیر کیے بغیر اسے بازو سے پکڑ کر واپس گھسیٹا تھا اور اگلے ہی پل وہ کھٹاک سے دروازہ بند کر چکے تھے۔ دروازہ لاک کرکے وہ پلٹے تو ان کے چہرے پر برہمی کے آثار نمایاں تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ گھر کے ملازمین ثانیہ کو غیر حالت میں گھر سے باہر نکلتے دیکھیں۔

"پلیز مجھے مت روکو۔ مجھے جانے دو۔ ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا یہاں۔" وہ چلائی تھی مگر اس چلانے میں ایک خوف تھا۔ سراسیمگی تھی جسے نوٹ کرتے ہوئے ہارون نے حتی الوسع اپنا لہجہ نرم بنانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کے سپاٹ اور دو ٹوک لہجے نے اسے بری طرح سہما دیا تھا۔

"دیکھو ثانیہ! جیسا تم سمجھ رہی ہو' ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے لیکن اگر کوئی دھوکے باز اور فریبی ہے تو وہ ہم نہیں تمہارے اپنے پیرنٹس ہیں کیونکہ انہیں آل ریڈی یہ معلوم تھا کہ زارون ابنارمل ہے۔"

"وہ۔۔۔ سب کچھ جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ۔۔۔" اس کے پورے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا تھا۔

"ہاں۔ انہیں سب معلوم تھا۔ اور مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہے کہ انہوں نے تمہیں اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بہرحال میں ابھی انہیں یہاں بلاتا ہوں اور ان کے آنے پر ہی فیصلہ ہوگا کہ تم یہاں رہو گی یا نہیں۔ لیکن اس بات کا اطمینان رکھو کہ تمہارے ساتھ قطعاً" کوئی زبردستی نہیں کی جائے گی۔ تمہیں اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے۔"

115

وہ تسلی آمیز لہجے میں کہہ رہے تھے مگر ثانیہ کچھ بھی سن نہ پائی تھی۔ دل سے اٹھتی آوازوں کا شور اس قدر تھا کہ کان میں کوئی دوسری آواز سما نہ سکی تھی۔ وہ لڑکھڑا گئی تھی اور گرنے سے بچنے کے لیے اس نے بے اختیار ہی کرسی کی پشت کو تھام لیا تھا۔

اور کتنا چاہا تھا اس نے کہ ہمیشہ کی طرح چپ چاپ' خاموشی سے' بڑی بہادری سے یہ وار بھی سہہ جائے مگر بہرحال تھی تو انسان ہی ناں۔ ایک کمزور ناتوان سی لڑکی۔ پہلا صدمہ ہی گھائل کردینے والا تھا اس پر یہ جان لیوا انکشاف کہ سب جانتے بوجھتے کیا گیا۔ وہ جو ساری عمر اسے لحہ لحہ موت دیتے رہے۔ تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونکی تو ان ہی ہاتھوں نے۔ بیس سال سے جو اژدھے قطرہ قطرہ زہر اس کے وجود میں اتارتے رہے تھے آج انہوں نے آخری بار بھی ڈس لیا تھا اور ایسا زہریلا ڈنک مارا تھا کہ اس کا سارا جسم نیل و نیل ہو گیا تھا۔

بہت کوشش کی تھی اس نے کہ نصیب کی سیاہی ذہن و دل پر حاوی نہ ہو مگر نجانے کیا ہوا تھا کہ ہر کوشش بے کار ہوتی چلی گئی۔ سیاہ رات اسے اپنی آغوش میں لینے کو آگے بڑھی تو آنکھوں تک اترتی چلی گئی اور وہ بھربھری مٹی کی طرح زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

اماں وزیراں نے لپک کر اسے سنبھالنا چاہا مگر اس نے سخت دیوانگی کے عالم میں انہیں خود سے دور ہٹا دیا تھا۔ وہ زمین پر گری آسمان کی طرف بانہیں پھیلائے بری طرح چلا رہی تھی۔ اس کی دلدوز چیخوں نے گھر کے درودیوار کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر آنکھ آنسو بہانے کو تیار نہ تھی۔ وجود میں ایک طوفان برپا تھا جسے نکلنے کو راستہ نہیں مل رہا تھا۔

وہ آج پہلی بار یتیمی کے دکھ سے آگاہ ہوئی تھی۔

آج پہلی مرتبہ اس نے اپنے مرے ہوئے باپ کو پکارا تھا۔

آج ہی ان کی موت پر بین کیے تھے۔ آج ہی اس کا دل گڑگڑایا تھا۔

اماں وزیراں نے اس کی حالت دیکھی تو دوپٹے میں منہ چھپا کر خود بھی سسک اٹھیں۔ ہارون لب بھینچے بس اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

صدیوں سے بنجر آنکھ کی کوکھ سے پہلے سپنے نے جنم لیا تھا اور تعبیر کی آنکھ کھلنے سے پہلے مر گیا تھا اور آنکھ ـــ آنکھ کا خدائی پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔

تتلی کے بے رنگ پروں پر پہلی بار بہار اتری تھی مگر کڑی دھوپ کے لمس نے تتلی کے پر ہی جلا ڈالے تھے۔

پتھریلی زمین سے اولین خواہشوں کی نوخیز فصل ابھری تھی جسے بارش کے زہریلے قطروں نے اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔

اور وہ ـــ اس سنگلاخ' بے آباد زمین کے کنارے کھڑی تھی۔

تہی داماں ـــ تہی دست

اور سوچ رہی تھی۔

''بعض لوگوں کی زندگی میں خوشی اور غم کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔''

ثانیہ کی زندگی میں بھی نہیں تھا۔ وہ خوشی کے لمس سے بھی ناآشنا تھی اور غم کو اس کی تمام تر گہرائیوں سمیت کھوج آئی تھی۔ اس بے کراں سمندر کی سرکش موجوں نے دکھ کے بے پایاں احساس سے مالا مال کر کے اسے ساحل پر لا پھینکا تھا اور اب وہ کتنی ہی دیر سے نیم جان' نڈھال سی پڑی اپنے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان معلق تھی۔

اماں وزیراں نے اس وقت سے ایک لمحے کے لیے بھی اسے تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھی مسلسل اس کا سر سہلا رہی تھیں۔ بغیر کچھ کہے۔ ایک دبیز خاموشی تھی جس میں ان دونوں کی سرسراتی سانسوں کے سوا کوئی اور آواز نہیں تھی۔

تب ہی ڈرائنگ روم سے ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دینا شروع ہوئیں۔

''میرا خیال ہے تمہارے ابا آگئے ہیں ـــ'' اماں

وزیراں نے خیال ظاہر کیا۔

"میرا باپ مر چکا ہے....." اس کا لہجہ کسی بھی احساس سے عاری تھا۔

"مگر......"

"میری ماں بھی اس دنیا میں نہیں ہے۔" اس نے اماں کو کچھ بولنے نہیں دیا تھا۔

"تو کیا یہ تمہارے ماں باپ.....؟"

"کیا ماں باپ اپنی اولاد کے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں؟" ثانیہ کے زہر خند لہجے پر اماں وزیراں نے آنکھیں چرالی تھیں۔

"اگر کر سکتے تو آج میری جگہ روبی یہاں ہوتی۔"

"اچھا تم بیٹھو میں ذرا وہاں دیکھ آؤں۔ ہارون ناراضگی میں ان سے نجانے کیا کیا کہہ دے۔" اماں کے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا سو وہاں سے اٹھ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ ثانیہ ان کے جانے کے بعد چند لمحے چھت پر نظریں جمائے لیٹی رہی اور اس کے بعد ایک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اب اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اور دل میں کہیں یہ بھی ٹھان رکھی تھی کہ اب اپنے بارے میں فیصلہ وہ خود کرے گی۔

اس نے دوپٹہ کھینچ کر گلے میں ڈالا اور ننگے پاؤں چلتی ہوئی باہر آگئی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے تک آکر اس کے قدم غیر ارادی طور پر سست پڑ گئے تھے۔ دروازے کا پردہ اٹھا کر اس نے اندر جھانکا۔ ہارون صوفے کی بیک پر دونوں ہاتھ جمائے سخت غصے میں لگ رہے تھے۔ تایا ابا اڑی اڑی رنگت لیے سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"کمال صاحب! آپ نے ثانیہ کو ہی نہیں مجھے بھی دھوکا دیا ہے۔ میں آپ پر یہ بات واضح کر چکا تھا کہ زارون نارمل نہیں ہے اور اسے ایک بیوی سے زیادہ ایک کیئر ٹیکر کی ضرورت ہے، جو چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہ کر خوش دلی سے اس کی ضروریات نبھا سکے اور اس کے لیے ہمیں ایک ایسی لڑکی کی ضرورت تھی جو نہ صرف تمام حقائق سے واقف ہو بلکہ تمام حالات کو بہادری کے ساتھ فیس کر سکے۔ لیکن آپ کمال صاحب! آپ نے محض آٹھ لاکھ روپے کے بدلے اس معصوم بچی کو اس عذاب میں دھکیل دیا ہے۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ آپ نے اسے اصل بات سے بے خبر رکھ کر اس پر کتنا ظلم کیا ہے۔" وہ سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ کھولتے لہجے میں بول رہے تھے۔ باہر کھڑی ثانیہ کے ہاتھ سے پردہ چھوٹ گیا تھا۔ اس نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے دیوار سے اپنی پشت ٹکا دی تھی۔

"میں مانتا ہوں ہارون صاحب! کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ لیکن آپ فکر مت کیجئے، ثانیہ بہت سمجھ دار ہے۔ میں اسے سمجھادوں گا تو وہ..." تایا ابا دھیمی آواز میں منمنائے تھے۔

"ہونہہ۔ محترم! بات اگر صرف سمجھانے کی ہے تو میرا خیال ہے، یہ کام میں آپ سے بہتر کر سکتا ہوں۔ لیکن بات تو پھر وہیں آجاتی ہے ناں کہ پہلے ثانیہ کا مائنڈ میک اپ کرو، اسے اس قابل بناؤ کہ وہ بیس بائیس سالہ بچے کو سنبھالنے لگے اور تب زارون کو اس کے حوالے کرو۔ یعنی میری پرابلم اور ٹینشن میں تو صرف اضافہ ہی ہوا ناں؟ یو نو مسٹر کمال! کہ مجھ جیسا بزنس مین چوبیس گھنٹوں میں سے بمشکل چار پانچ گھنٹے اپنے لیے نکال پاتا ہے۔ میں اگر زارون کی شادی کرنے پر آمادہ ہوا تھا تو صرف اس واسطے کہ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس کی شادی ہو جائے تو اس کے ٹھیک ہو جانے کا امکان ہے۔ میں اسے وہ وقت، وہ توجہ نہیں دے پاتا تھا جو وہ ڈیزرو کرتا ہے۔ میں زارون کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنا کام کرنا چاہتا تھا۔ یکسو ہو کر اپنے کاروبار کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن اب ایک لڑکی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ہم اسے اس گھر میں لے آئے ہیں اور اس کے باوجود آفس میں فائلوں میں سر کھپاتے ہوئے میرا دھیان گھر میں اٹکا رہے تو آپ بتائیے کہ اس شادی سے ہمیں کیا فائدہ حاصل ہوا؟

پرابلم تو وہیں کا وہیں ہے جسے حل کرنے کے لیے میں نے آٹھ لاکھ کی رقم ڈبوئی اور آپ نے ایک جیتی

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

جاگتی لڑکی کی زندگی برباد کرڈالی۔" ہارون کے طیش کا تو یہ عالم تھا کہ تایا ابا کی تو گردن جھکی جارہی تھی۔ اماں وزیراں نے بھی سانس روک لی تھی۔

ان کے دبنگ لہجے کے سامنے تو بڑے بڑوں کی جان نکل جاتی تھی سو تایا ابا بھی چپکے بیٹھے تھے۔ ہارون چند لمحے ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے خود پر قابو پاتے رہے پھر اماں وزیراں کی طرف متوجہ ہوگئے۔

"اماں! آپ ثانیہ کو بلا لائیں۔ وہ ان کے ساتھ جانا چاہتی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" وہ صوفے پر بیٹھ کر گلاس میں پانی انڈیلنے لگے تھے۔

"ہارون صاحب! آپ پریشان مت ہوں۔ میں نے کہا ناں، میں ثانیہ کو سمجھادوں گا۔ وہ آپ کے لیے ہرگز مسئلہ نہیں بنے گی۔ بڑی سمجھ دار بچی ہے وہ۔" تایا ابا اماں وزیراں کے جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر ـــ گھگھیائے تھے۔

ان کی بات پر ہارون نے بھنویں اچکا کر ایک لحظے کے لیے انہیں دیکھا اور پھر سر جھٹک کر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگے۔

"میرا خیال ہے، ثانیہ سے زیادہ آپ کو اس رقم کی فکر ہے۔ بے فکر رہیے میں دی ہوئی چیز واپس نہیں لیا کرتا۔ یوں بھی میں نے وہ رقم آپ کی مالی امداد کے طور پر آپ کو دی تھی۔ ثانیہ کے عوض نہیں۔ کیونکہ بقول آپ کے آپ ایک بے روزگار شخص ہیں اور آپ کے ناتواں کندھوں پر ذمے داریوں کا بے تحاشا بوجھ ـــ حالانکہ اب تو مجھے اس بات پر بھی شک ہے۔" ہارون کا طنزیہ لہجہ انہیں پانی پانی کر گیا تھا۔ تب ہی اماں گھبرائی گھبرائی سی چلی آئیں۔

"ہارون میاں وہ ـــ"

"کیا ہوا؟ ثانیہ نہیں آئی؟"

"وہ تو اپنے کمرے میں بند ہوگئی ہے۔ دروازہ ہی نہیں کھول رہی۔" اماں پریشان تھیں۔

"اسے کمال صاحب کی آمد کا علم ہے؟"

"جی ہاں۔ اسے معلوم ہے۔"

"ہوں۔" انہوں نے ایک لحظے کے لیے سوچا اور پھر ثانیہ کے تایا کی طرف پلٹے۔

"ٹھیک ہے۔ آپ جائیں۔ ثانیہ جو بھی فیصلہ کرے گی، ہم آپ کو آگاہ کردیں گے۔ اگر وہ واپس جانا چاہے گی تو میں خود اسے لے آؤں گا۔" انہوں نے دو ٹوک انداز میں کہہ کر گلاس ٹیبل پر رکھا اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

تایا ابا نے گھبرائے گھبرائے سے انداز میں اماں وزیراں کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ان کے لیے اتنا تنفر تھا کہ وہ گھبرا کر فوراً وہاں سے چل دیے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

آفس سے واپسی پر گاڑی پورچ میں کھڑی کرنے کے بعد ہارون اپنے کمرے کی طرف آئے تو اماں وزیراں ستا ستا چہرہ لیے ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھیں۔ ان کا پہلا خیال حسبِ عادت زارون کی طرف گیا تھا سو بریف کیس رکھتے ہوئے سب سے پہلے اسی کے متعلق استفسار کیا تھا۔

"وہ پچھلے لان میں ہے۔"

"اکیلا۔" ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رکے۔

"نہیں، ڈینو ہے اس کے پاس۔"

"کھانا کھالیا اس نے؟" انہوں نے کوٹ اتار کر بیڈ پر رکھا اور بیڈ پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگے۔

"نہیں۔ دودھ پی لیا تھا۔ ویسے آج سارا دن وہ اپنے کمرے میں جانے کی ضد کرتا رہا ہے۔" اماں لگے ہاتھوں اپنے مطلوبہ موضوع کی طرف آگئیں۔

"تو ـــ؟" انہوں نے جھکا ہوا سر اٹھا کر استفہامیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"دروازہ تو اندر سے بند ہے میاں۔ ثانیہ نے ـــ"

"واٹ ـــ کیا وہ ابھی تک کمرے سے باہر نہیں آئی۔" وہ شدید حیرت کے زیرِ اثر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"اور بریک فاسٹ ـــ لنچ ـــ؟" اماں کا سر نفی میں

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

ہلتے دیکھ کران کی تشویش میں اضافہ ہوا تھا۔

"کچھ بھی نہیں میاں! کل سے جوں کی توں کمرے میں بند ہے۔ میں تو صبح سے دروازہ بجا بجا کر تھک گئی۔"

"کمال ہے۔ اگر ایسی بات تھی تو آپ کو میرے آفس فون کردینا چاہیے تھا۔" وہ ایک دم جھنجلا سے گئے۔

"حد ہوگئی یعنی کہ۔۔۔ شام بھی ڈھلنے کو ہے اور وہ کل رات سے۔۔۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھے اور دراز کھول کر اس میں سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر ایک چابی نکالی اور دراز بند کرکے اماں کی طرف پلٹے۔

"یہ لیں چابی اور باہر سے دروازہ کھول لیں۔ دیکھیں جاکر اس کو کہیں کچھ کر کرا نہ بیٹھی ہو۔" انہوں نے چابی اماں کے ہاتھ میں تھمائی اور خود سلیپروں کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگے۔ اماں نے فوراً سلیپر نکال کران کے سامنے رکھے اور خود باہر کی طرف لپکیں۔

کپکپاتے ہاتھوں سے لاک کھولا اور ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔ کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ثانیہ دونوں ہاتھ سینے پر دھرے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اماں نے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا اور چٹاک چٹاک کمرے کی ساری لائٹس آن کردیں۔ کمرہ سفید دودھیا روشنی میں نہا سا گیا تھا۔ ثانیہ نے روشنی سے بچنے کے لیے اپنا بازو آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔

اسے صحیح سلامت دیکھ کر اماں وزیراں نے دل ہی دل میں خدا کا ہزاروں بار شکر ادا کرڈالا۔

"ثانیہ! تم ٹھیک تو ہونا ں؟" اماں نے اس کا بازو آنکھوں سے ہٹانے کی کوشش کی تو اس نے کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔

"ٹھیک ہوں اماں! مجھے کیا ہونا تھا؟" اس نے اپنی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔

"تم نے۔۔۔ تم نے کل سے کچھ بھی نہیں کھایا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں بہت ڈھیٹ ہوں اماں اور میری ڈھٹائی کا اندازہ اسی بات سے لگالیں کہ اتنی بڑی بات ہوگزری مگر میرا نروس بریک ڈاؤن ہوا نہ دل نے دھڑکنا چھوڑا۔ میں اب بھی ویسی کی ویسی ہوں۔ ایک دم فٹ فاٹ۔"

اب اس نے آنکھیں کھول کر چھت پر جمادی تھیں اور اس کے ہونٹوں پر پھیلی زہر خند سی مسکراہٹ دیکھ کر اماں کو خوف سا محسوس ہوا تھا۔

"تم فکر کیوں کرتی ہو۔۔۔ سب۔ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔"

"ہاں۔۔۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔" اس نے کروٹ بدل کر بازوؤں میں چہرہ چھپالیا تھا۔

"مگر۔۔۔ مگر مجھے کچھ وقت چاہئے۔ زیادہ نہیں۔ صرف آج کی رات۔ مجھے خود کو سمیٹ لینے دیں پھر اس کے بعد کسی کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

"لیکن بیٹی۔"

"آپ جائیں اماں اور لائٹ بھی بند کردیں۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"مگر۔۔۔ میں بھی تمہارے ساتھ رات یہیں گزاروں گی۔" اماں کو ڈر تھا کہیں وہ غلط قدم نہ اٹھالے اور ثانیہ بھی جیسے ان کے خدشات جان کر پھیکی سی ہنسی ہنس دی تھی۔

"کن خدشوں میں پڑی ہو اماں۔۔۔! میں بہت بزدل ہوں' خود کو تکلیف نہیں دے سکتی۔ اگر ایسی ہی بہادر ہوتی تو ان بیس سالوں میں کئی بار اپنی شہ رگ کاٹ چکی ہوتی یا پھندا ڈال کر۔۔۔"

"ایسی باتیں نہ کرو بیٹی! خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔" اماں کا تو دل ہی دہل گیا تھا اور وہ کیسے اطمینان سے کہے جارہی تھی۔ انہوں نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

"ارے میں نے تو تجھے دیکھتے ہی اپنی بیٹی بنالیا تھا اور تو کیسی بیٹی ہے کہ اپنے ہاتھوں اپنی ماں کا کلیجہ نوچے جارہی ہے۔ تجھے میری قسم جواب تونے ایسا کچھ کہا۔" اماں وزیراں کی آواز میں نمی گھل گئی تھی۔

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

ثانیہ نے سر اٹھا کر گہری نگاہوں سے انہیں دیکھا اور پھر طویل سانس لے کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گویا ان کی بات مان لی تھی۔

"اچھا۔۔۔ میں کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔" انہوں نے اسے ڈھیلا پڑتے دیکھا تو فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اماں! ابھی مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ بھوک لگی تو خود اٹھ کر آپ سے مانگ لوں گی۔" اس کے دوٹوک انکار پر اماں نے تاسف بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر سر جھکا کر کمرے سے باہر نکل گئیں اور کمرہ ایک مرتبہ پھر تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

ہارون آفس جا چکے تھے اور زارون ایک مرتبہ پھر دروازے پر کھڑا ہنگامہ مچا رہا تھا۔

"یہ بہت اسٹوپڈ دلہن ہے۔ اسے نکالو میرے کمرے سے باہر۔" وہ دروازہ پیٹتے ہوئے بری طرح چلا رہا تھا۔

"زارون میاں۔۔۔ کیا ہوا؟" اماں وزیراں کچن سے بھاگی آئی تھیں۔

"وہ۔۔۔ وہ اندر میری ساری چیزیں خراب کر دے گی۔ میرے کھلونے' مجھے چاہئیں۔ تم باہر نکالو اس ایڈیٹ کو۔" وہ غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔

"بیٹا۔۔۔! آپ ٹھہرو تو سہی میں۔۔۔" اس سے پہلے کہ وہ زارون کو کچھ سمجھاتیں اندر سے دروازے کی چٹخنی گرانے کی آواز آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا تھا۔

"تم۔۔۔ تم اندر کیا کر رہی تھیں ہاں۔ یہ کمرہ تمہارا ہے کیا؟" زارون نے ثانیہ کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر زور سے دھکا دیا تو وہ لڑکھڑا سی گئی۔

"اگر آئندہ۔۔۔ آئندہ تم میرے کمرے میں گھسیں تو۔۔۔ تو میں تمہیں یہ ماروں گا۔" اس نے پیتل کا بڑا گلدان ہاتھوں میں لیا تو اماں وزیراں فوراً اس کے سامنے آگئیں۔

"ارے۔۔۔ ارے لاؤ بیٹا! یہ مجھے دے دو۔ اس سے چوٹ لگ جائے گی۔ میں۔۔۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔ اب یہ تمہارے کمرے میں نہیں آئے گی۔" اماں نے فوراً اسے بہلا پھسلا کر گلدان اس کے ہاتھوں سے لے لیا تھا ورنہ اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ کسی کا سر ہی پھوڑ دیتا۔

"آؤ ثانیہ! تم میرے ساتھ آؤ۔" انہوں نے پلٹ کر ثانیہ سے کہا جو بے تاثر چہرہ لیے بکھرے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑس رہی تھی۔ اماں کی بات سن کر وہ چونکی اور پھر چپ چاپ ان کے پیچھے چل دی تھی۔ وہ پہلی بار اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ ڈسٹنگ کرتی ہوئی ملازمہ نے بڑے اشتیاق سے اسے دیکھ کر سلام جھاڑا تھا۔

"سلام باجی۔۔۔!" اور ثانیہ کو بے اختیار جینا کی یاد آگئی تھی۔

"ثانیہ! ناشتے میں کیا لوگی۔" کچن میں داخل ہوتے ہی اماں نے اس سے پوچھا۔ مگر وہ اپنی ہی سوچوں میں گم رہی۔ اماں نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر خود ہی اس کے لیے ناشتہ بنانے لگیں۔ جب تک اماں کام میں مصروف رہیں ثانیہ کرسی پر بیٹھی کچن کی ٹیبل پر انگلی سے نادیدہ لکیریں کھینچتی رہی۔

"لو بیٹی! شروع کرو۔" اماں نے چائے کے ساتھ اور بہت سی چیزیں اس کے سامنے میز پر رکھ دی تھیں۔ اس نے ابھی چائے کا پہلا گھونٹ بھرا تھا جب زارون وہاں چلا آیا۔ عجیب بے ترتیب سا حلیہ ہو رہا تھا اس کا۔ شرٹ ٹراؤزر سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ کھلے کف ہاتھوں پر لٹک رہے تھے۔ گریبان کے دو بٹن کھلے تھے اور گلے میں جھولتی سونے کی چین اس نے سامنے سے اٹھا کر منہ میں ڈال رکھی تھی۔

"اماں۔۔۔" اس نے آتے ہی ادھر ادھر دیکھے بغیر انہیں پکارا۔

"جی زارون میاں۔"

"اماں! میں کیا کروں؟"

"کیوں کیا ہوا؟" اماں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میں۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔ تم۔۔۔ تم آؤ۔۔۔ میرے ساتھ کھیلو۔" وہ اپنی بے پناہ فراغت سے سخت

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

نالاں لگ رہا تھا۔

"ارے بیٹا! اب مجھے تو بخشو تم۔ ثانیہ آگئی ہے ناں۔ اب اس کے ساتھ کھیلا کرو تم۔"

"کون ثانیہ؟" وہ بے تکلفی سے میز پر سوار ہو کر بسکٹ اٹھا کر کترنے لگا تھا۔

"تمہاری دلہن کی بات کر رہی ہوں۔ اس کا نام ثانیہ ہے ناں۔" اماں کے تعارف کروانے پر اس نے ایک لمحہ بغور اسے دیکھا اور اگلے ہی پل میز سے اتر کر دھم سے اس کے برابر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ثانیہ ایک دم گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ زارون اس کی گھبراہٹ پر بے ہنگم طریقے سے ہنس دیا تھا۔

"ثانیہ! بیٹھو تم۔ کچھ نہیں کہے گا تمہیں۔ یہ تو بہت معصوم ہے۔" اماں نے کہا تو درمیان میں ایک کرسی چھوڑ کر وہ اگلی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ اب یہاں رہے گی۔؟" اس نے اماں سے سوال کرنا شروع کر دیے۔

"ہاں۔"

"سارے دن ہمارے پاس رہے گی؟"

"ہاں۔ ہمیشہ یہاں رہے گی۔"

"یہ میرے ساتھ فائٹ تو نہیں کرے گی ناں؟"

"ارے بابا نہیں کرے گی۔ یہ تو بہت اچھی ہے۔" اماں عادی ہو چکی تھیں سو مستقل مزاجی سے اس کے سوالوں کا جواب دیے جا رہی تھیں۔

"اچھی تو نہیں ہے۔ کل سے میرے کمرے میں گھسی بیٹھی تھی۔ مجھے اس نے اندر نہیں جانے دیا۔" اس نے بھرپور شکایتی لہجے میں کہتے ہوئے ثانیہ کو گھورا۔

"بھئی اب ثانیہ کا بھی وہی کمرہ ہے۔ کیونکہ تمہاری دلہن ہے اس لیے تمہارے کمرے میں رہے گی۔" اماں نے اسے سمجھایا اور ثانیہ نے غیر ارادی طور پر اپنا ہونٹ کاٹ کاٹ کر سرخ کر ڈالا تھا۔

"میری دلہن ہے۔ جیسے پنک پینتھر اور ڈیزی میرے ہیں ویسے ہی؟" اس نے اپنے کھلونوں کے نام لیے جن سے وہ دن رات کھیلتا تھا اور ثانیہ کو نجانے کیا ہوا کپ اس کے ہاتھ سے پھسل گیا تھا اور وہ خود بھاگتی ہوئی کچن سے باہر نکل گئی تھی۔

"ثانیہ۔!" اماں اسے پکارتی ہوئی اس کے پیچھے لپکیں۔ وہ کوریڈور میں دیوار سے لگی کھڑی تھی اور دونوں ہاتھ منہ پر رکھے سسکیاں روکتے ہوئے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

"ثانیہ! میری جان کیا ہو گیا؟" انہوں نے فوراً اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

"اماں! بہت مشکل ہے۔ بہت مشکل ہے یہ سب سہنا۔" وہ ایک بار پھر بری طرح بکھر گئی تھی۔ اماں اسے دلاسا کیا دیتیں بس چپ چاپ اس کے بال سنوارتی اور پیٹھ سہلاتی خاموش کرواتی رہیں۔

جب کہ ان کے عقب میں کھڑا زارون حیران حیران نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے تاسف سے سر ہلا رہا تھا۔

"یہ تو ہر وقت روتی رہتی ہے۔ میری اور اس کی فرینڈشپ نہیں ہو سکتی۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

زندگی بہت خوبصورت تو پہلے بھی نہ تھی مگر اس بار جو اس نے اپنے چہرے سے نقاب الٹا تھا تو ثانیہ اس کی کریہہ صورت دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ خود اذیتی کا عمل اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا ثانیہ نے سمجھ لیا تھا۔ اس نے ٹھان لی تھی کہ وہ تقدیر کے اس وار کو بھی سہہ جائے گی۔

مگر خود کو مار کر زندہ رکھنا آسان ہوتا ہے کیا؟

وہ خود پر جبر کر بھی لیتی مگر اس احساس کا کیا کرتی جو شادی کے نام پر اس کے کنوارے جذبات میں ہلچل مچا گیا تھا۔

وہ جو کسی مضبوط شانے پر سر رکھ کر ٹوٹ کر رو دینے کی معصوم سی خواہش دل میں جاگی تھی اسے ابدی نیند کیسے سلا دیتی۔

اور اماں وزیراں نے اس سے کہا تھا۔

"وہ معصوم ہے، سادہ ہے، اللہ لوک ہے۔ تم اسے

اپنی توجہ اور محبت دوگی تو وہ تمہیں ہم سے بڑھ کر چاہے گا۔"

"مگر کیسے؟ یہ دل اس کی طرف مائل ہو اسے اپنا سمجھے تب ناں؟"

اس نے بے بسی کے شدید احساس سے مغلوب ہوتے ہوئے اپنا سر کھڑکی کے پٹ سے ٹکا دیا۔ رات کا آخری پہر تھا۔ کھڑکی کے اس پار پوری کائنات گھور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ طویل قامت درخت' پھول' بوٹے' پتے' ہر چیز غیر معمولی طور پر سنسان اور گمبھیر چپ کی زد میں تھے۔ سبک خرام ہوا قدرے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیے اور پھر پلٹ کر زارون کو دیکھنے لگی جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کی وادیوں میں گھوم رہا تھا۔

نائٹ بلب کی نہایت مدھم روشنی میں زارون کے ساحرانہ نقوش سے نظر ہٹانا اس کے لیے کچھ ایسا آسان نہ تھا۔ وہ بلاشبہ ایک انتہائی خوبصورت اور حسین نوجوان تھا۔ ہاں اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی حد درجہ معصومیت ہی تھی جو دیکھنے والے کو چونکا دیتی تھی۔ اس وقت بھی اس کی آنکھیں پوری طرح بند نہ تھیں۔ وقفے وقفے سے ہلتے ہوئے ہونٹ اس بات کی علامت تھے کہ اسے نیند میں بڑبڑانے کی عادت بھی تھی۔ اس کے حلق سے نکلتی بے معنی آوازیں ثانیہ کو رات کی اس تنہائی میں بری طرح خوفزدہ کر دیتی تھیں۔

لیکن کیا کرتی..... اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خود پر ظلم ڈھاتے ہوئے آٹھ لاکھ روپوں کا حق ادا کرتی جو اس کے بدلے اس کے تایا کو ادا کیے گئے تھے۔

تب ہی ایک دم زارون سوتے سے بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ثانیہ سہمی سہمی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس نے یونہی بڑبڑاتے ہوئے خمار آلود نظریں ادھر ادھر دوڑائیں اور پھر ثانیہ کو دیکھنے لگا۔ عجیب بے تاثر اور خالی خالی نظریں تھیں اس کی۔ وہ یقیناً" اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے لگ رہا تھا کہ اس پر ابھی تک نیند کا غلبہ ہے۔ کچھ دیر تک وہ یونہی ٹکٹکی باندھے ثانیہ کو دیکھتا رہا۔ ثانیہ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ پھر زارون کی بوجھل پلکیں بند ہونے لگیں۔ تب وہ دوبارہ بیڈ پر لیٹ گیا اور چند لمحوں بعد اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ ثانیہ نے اپنا رکا ہوا سانس خارج کیا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بیڈ تک آئی۔ ایک خالی نظر زارون پر ڈالی اور پھر بیڈ کے کنارے پر سمٹ کر لیٹ گئی کہ رات تو بہر طور بسر کرنی ہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ اماں وزیراں کی تلاش میں ہارون کے کمرے کی طرف آئی تو کھلے دروازے کے باہر ٹھٹھک سی گئی۔ ہارون آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا اور اماں وزیراں خفگی آمیز اپنائیت سے ان کے سر پر کھڑی بول رہی تھیں۔

"نہ دوپہر کا کھانا' نہ رات کا۔ میاں! کیا ہوا کھا کر زندہ رہتے ہو۔"

"اماں! دفتر میں۔۔۔"

"لو کیا ملتا ہوگا دفتر میں۔ مجھے تو لگتا ہے سارا دن چائے پی پی کر گزارہ کرتے ہو۔ رنگ بھی تو دیکھو کیسا سنولا گیا ہے۔ پہلے تو ماشاءاللہ نظر نہ ٹکتی تھی چہرے پر۔"

"تو اب کیا پھٹکار برستی ہے چہرے پر۔" ہارون جوتا پہن کر ہاتھ دھونے واش روم میں گھس گئے۔

"اے لو! خدا نہ کرے۔ پھٹکار کیوں برسنے لگی۔ میں تو بس اتنا کہتی ہوں کہ کاروبار تو سب ہی لوگوں کا چلتا ہے اور چلتا ہی رہتا ہے۔ پھر ایسا بھی کیا کہ بندہ کھانے پینے کا ہوش ہی بھلا دے۔ کم از کم اپنی صحت' اپنے آرام کا خیال تو رکھنا چاہیے نا انسان کو۔"

"بالکل ٹھیک فرما رہی ہیں آپ۔" واش روم سے باہر نکل کر وہ آئینے کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور ڈھیر ساری پرفیوم خود پر انڈیلی۔

"تو پھر دوپہر کے کھانے پر گھر آ رہے ہو نا؟" اماں

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

نے بڑی امید سے پوچھا۔

"یہ میں نے کب کہا؟" ان کے ہونٹوں پر شرارتی سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"اے لو! تو میں جو گھنٹے بھر سے بول رہی ہوں وہ سب بے کار گیا۔" اماں ایک دم ہی بگڑ گئی تھیں۔

"میں نے یہ بھی نہیں کہا؟" وہ کبھی کبھار ہی ایسے موڈ میں نظر آتے تھے۔ اماں وزیراں گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

"ہارون میاں! مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ سیدھے سیدھے بس اتنا بتادو کہ دوپہر کو کھانے پر آؤ گے کہ نہیں؟"

"آپ تو ناراض ہونے لگیں۔" انہوں نے والٹ چیک کر کے جیب میں رکھا اور موبائل اٹھاتے ہوئے ان کی طرف پلٹے۔

"ایسا ہے اماں کہ دوپہر میں آنا بہت مشکل ہے۔ ڈنر البتہ میں گھر میں کر سکتا ہوں۔"

"سوچ لو۔ کہیں ایسا نہ ہو یہ بڑھیا سارا دن کچن میں سر کھپائے اور رات کو بیٹھی کی بیٹھی رہ جائے۔"

"نہیں۔ میں آجاؤں گا۔" انہوں نے اماں کو تسلی دی۔

ہارون کو باہر نکلنے کے لیے تیار دیکھ کر ثانیہ وہاں سے ہٹ کر لاؤنج میں آگئی تھی۔ تب ہی ملازم نے آکر ہارون کو کسی کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ اور آنے والے کا نام سن کر ثانیہ اضطراری انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہارون نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر ملازم کی طرف پلٹے۔

"کمال صاحب کو یہیں لے آؤ۔"

ثانیہ نے اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر قدم اپنے کمرے کی طرف بڑھا دیے۔

"ثانیہ!"

ہارون کی آواز پر وہ رکی ضرور تھی مگر پلٹی نہیں تھی۔

"کمال صاحب آئے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔" اس کے سپاٹ لہجے پر ہارون نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"وہ تم سے ملنے آئے ہیں۔" ہارون نے جیسے اسے اطلاع دی تھی۔

"لیکن میں ان سے ملنا نہیں چاہتی۔"

"مگر کیوں؟" ان کے لہجے میں پوچھتے وقت حیرت در آئی تھی۔

"ہارون صاحب! دکاندار اپنے شوکیس میں سجی کوئی چیز فروخت کر ڈالے تو پھر اس چیز سے اس کا کوئی تعلق رہتا ہے اور نہ واسطہ۔ کمال صاحب آپ سے میری قیمت وصول کر چکے ہیں تو پھر اب وہ کس رشتے، کس ناتے سے مجھ سے ملنے آئے ہیں۔" ثانیہ کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ ہارون اپنی جگہ دم بخود سا کھڑے رہ گئے تھے۔

"میں نے تاعمر اس گھر میں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے ہارون صاحب۔ اس لیے نہیں کہ میرے پاس کوئی جائے پناہ نہیں رہی۔ اس لیے کہ آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مجھ بے مول کو انمول کر دیا ہے، آپ لوگوں نے اتنی بڑی قیمت ادا کردی میری اپنی نہ سہی دوسروں کی نظروں میں تو معتبر ہو گئی ناں میں۔ مجھ جیسی کم مایہ کو تو اونے پونے داموں میں خریدا جاسکتا تھا مگر۔۔۔ آپ ۔۔۔ آپ واقعی بہت سخی ہیں ہارون صاحب۔ آپ نے تو واقعی مجھے خرید لیا ہے۔"

"ثانیہ!" وہ گڑبڑا سے گئے۔ ثانیہ کی باتوں نے ان کا قد ان ہی کی نظروں میں گھٹا دیا تھا۔

"اب ایک مہربانی اور کیجئے۔ اگر آپ نے اس شخص کو مزید دینے دلانے کا وعدہ نہیں کر رکھا تو اسے یہاں آنے سے منع کر دیجئے۔" اس نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو سختی سے رگڑ ڈالا۔

"لیکن ثانیہ! میں انہیں تم سے ملنے سے کیسے منع کر سکتا ہوں آخر وہ تمہارے ـــــ"

"وہ میرے کچھ نہیں لگتے۔ اور انہیں مجھ سے ملنے سے آپ منع نہیں کر رہے، میں نے خود انکار کیا ہے۔ اگر آپ اپنے طور پر ان سے میل جول رکھنا چاہیں تو بصد شوق مگر خدارا مجھے ان سے ملنے پر مجبور مت کیجئے

گا۔" یہ کہہ کر وہ مزید وہاں نہ رک سکی تھی۔

ہارون لب بھینچے اسے وہاں سے جاتے دیکھتے رہے۔

"اماں! کمال صاحب سے کہلوا دیجیے کہ ثانیہ ان سے ملنا نہیں چاہتی اور ۔۔۔ وہ آئندہ یہاں آنے کی زحمت نہ کریں۔" انہوں نے اماں سے کہا اور خود وہیں صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئے۔ ان کی سوچ پر بڑی کاری ضرب لگی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"ثانیہ!" وہ کتنی ہی دیر سے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ ٹکائے کھڑی تھی جب زارون بے تکلفی سے اسے پکارتا کمرے میں آگیا۔

"ثانیہ!" اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا وہ اس کے نزدیک کھڑا تھا اور غالباً" اس کے متوجہ ہونے کے انتظار میں تھا۔ سو اس سے نگاہ ملتے ہی بول اٹھا۔

"چلو کھانا کھائیں۔" وہ بڑی آمادگی کے ساتھ اسے بلا رہا تھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس کا لہجہ خود بخود روکھا سا ہو گیا تھا۔

"نئیں ہم تم چلو میرے ساتھ۔"

ثانیہ نے ایک سپاٹ سی نگاہ اس پر ڈالی اور پھر رخ موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"بھائیاں بھی ہیں وہاں ۔۔۔ کھانے پر ۔۔۔ تم بھی آؤ ۔۔۔" وہ اپنے مخصوص اٹکے اٹکے انداز میں بات کر رہا تھا۔

"ثانیہ! سنتی نہیں ہو۔" اس نے اس کے دوپٹے کو پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا تو وہ جھنجلا گئی۔

"زارون! مجھے بھوک نہیں لگی۔ تم جا کر کھانا کھا لو۔" اس نے چبا چبا کر کہا۔ مگر وہ زارون اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ وہ سمجھ بوجھ سے عاری ایک معصوم انسان تھا۔ ثانیہ کی جھنجلاہٹ، گریز یا نفرت کو سمجھنا اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ تو ثانیہ کو ہمہ وقت اس گھر میں موجود دیکھ کر اس سے مانوس ہو چلا تھا۔ مگر ثانیہ کے لیے فوری طور پر سمجھوتا کرنا ممکن نہیں تھا۔

وہ حتی الامکان کوشش کرتی تھی کہ زارون کی ضروریات کا خیال رکھے۔ سو اس کے کپڑے تیار رکھنا، اس کے لیے کوئی غذا تیار کروانے کا کام وہ کر لیتی تھی مگر زارون کی جذباتی تسکین وہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اکثر اوقات چڑ جاتی تھی۔ یہ اماں وزیراں ہی تھیں جو ایک بچے کی سطح پر آکر اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے ہوئے اس کا دل بہلائے رکھتی تھیں یا وہ ملازم تھے جو چوبیس گھنٹے احتیاطاً" زارون کے گرد گھومتے رہتے تھے۔

"ثانیہ! چلو نا۔" زارون دل کی بات پوری کیے بنا چین نہیں لیتا تھا سو اب بھی اس کے سر پر سوار تھا۔

"اوہ خدایا۔" اس نے بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹ ڈالے۔

"ٹھیک ہے تم چلو میں آ رہی ہوں۔" وہ خود پر قابو پاتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی تھی۔ خیال یہی تھا کہ اسے ٹال دے گی مگر زارون اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچنے لگا تھا۔ مجبوراً" اسے وہاں سے اٹھنا ہی پڑا تھا۔

ہارون نے واش بیسن پر ہاتھ دھوتے ہوئے دیکھا، زارون خوشی خوشی ثانیہ کا ہاتھ پکڑے کھانے کی میز پر لا رہا تھا جبکہ ثانیہ کے چہرے پر کوفت و بیزاری کے تاثرات نمایاں تھے۔ انہوں نے زارون کو ٹوکنے کا ارادہ کیا مگر پھر خاموش ہو رہے۔

"شاید اسی طرح زارون ثانیہ کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔" انہوں نے صابن ہاتھوں پر رگڑتے ہوئے پل بھر کے لیے سوچا تھا۔

"آجایئے ہارون میاں!۔" مختلف ڈشز ڈائننگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اماں نے پکارا تو وہ تولیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے ٹیبل تک آگئے۔ کھانے کے دوران وہ ان الفاظ اور جملوں کو ترتیب دیتے رہے جو ثانیہ کو حقیقت حال سے باخبر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تسلی و تشفی کا کام بھی کر دیتے۔ وہ اسے بتانا چاہ رہے تھے کہ کمال احمد کو وہ رقم بطور قرض انہوں نے اس وقت دی تھی جبکہ ان کے ذہن میں زارون کی

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

شادی کا خیال تک نہیں تھا اور وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ وہ ان کے پرانے خدمت گزاروں میں سے تھے۔

لیکن جب زارون کی شادی کے بارے میں ڈاکٹروں نے کہا تو انہوں نے اکا دکا لوگوں سے مشورہ کیا تو بات کسی طرح کمال احمد تک بھی جا پہنچی اور وہ اگلے ہی روز اس کے آفس میں آموجود ہوئے۔

"میری ایک بچی بے حد نیک، سمجھ دار اور نہایت خدمت گزار ہے۔ اور پھر یہ تو نیکی اور ثواب کا کام ہے۔ وہ زارون میاں کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے گی۔"

"ٹھیک ہے کمال صاحب! مگر اس بات کا خیال رہے کہ لڑکی نہ صرف میچور بلکہ تمام صورتحال سے باخبر بھی ہونی چاہیے تاکہ وہ یہ کام ——— خوش اسلوبی سے نبھا سکے۔ اس کے لیے بہتر ہو گا کہ آپ گھر والوں کے ساتھ اپنی بچی کی مرضی بھی معلوم کر لیں۔"

"ایسا ہی ہو گا صاحب! مگر ایک اور بات بھی ہے۔"

"وہ کون سی؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا اور جواباً" انہوں نے بغیر کسی جھجک اور ہچکچاہٹ کے وہ بات انہیں بتا دی تھی جس میں انہوں نے واضح طور پر ان سے کہہ دیا تھا کہ ایسی صورت میں جو رقم انہوں نے بطور قرض لی ہے وہ واپس نہ لی جائے۔

"تو گویا آپ اپنی بیٹی کی قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں۔" وہ یکدم بگڑ گئے تھے۔

"ایسی بات نہیں۔ ابھی کچھ ماہ پہلے میں نے اپنی بڑی بیٹی کی شادی کی ہے جو اسٹور میں چلاتا ہوں وہاں سے بھی آمدنی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ اب اتنی جلدی دوسری بیٹی کی شادی ——— آپ سمجھ رہے ہیں نا؟ میرا مطلب ہے رشتے داری میں تو ———" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور وہ طویل سانس لے کر رہ گئے۔

دل میں بس یہ ہی سوچا تھا کہ وہ ایک جیتی جاگتی لڑکی ایک ابنارمل شخص سے بیاہنے کو تیار ہیں جو کہ ان کا سگا بھائی ہے تو انہیں بھی ان کی مجبوری کا کچھ خیال کرنا چاہیے۔ سو اس نے اثبات میں سر ہلا کر نہ صرف ان کا مطالبہ تسلیم کیا تھا بلکہ کچھ رقم شادی کی تیاری کے لیے بھی دی تھی۔

اور اب یہ ہی بات وہ ثانیہ کے سامنے کھول کے رکھ دینا چاہتے تھے۔ اس نے ہمیشہ اس گھر میں رہنا تھا تو ضروری تھا کہ اپنے دل سے تمام کدورتیں نکال کر وہ اس گھر میں اپنے اصل مقام کو سمجھ لے۔ یہ ہی سوچتے ہوئے انہوں نے پانی کا گلاس اٹھا کر اپنے سامنے رکھا اور ثانیہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

لیکن ثانیہ کے چہرے پر پھیلے تاثرات نے انہیں بری طرح چونکا دیا تھا۔ اس کے ماتھے پر تیوریوں کا جال سا بچھا ہوا تھا اور نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے، اپنی پلیٹ پہ سختی سے نظریں جمائے وہ گویا خود پر کڑا ضبط کیے بیٹھی تھی۔

انہوں نے الجھن آمیز نظروں سے پہلے اسے اور پھر زارون کو دیکھا تو بات جیسے ایک پل میں ان کی سمجھ میں آگئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا چمچ پلیٹ میں تقریباً پھینکتے ہوئے وہ عجلت میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

زارون فروٹ ٹرائفل کھا رہا تھا اور عموماً" اماں وزیراں ہی اسے کھانا کھلایا کرتی تھیں اس وقت وہ غالباً" کسی کام سے کچن میں مصروف تھیں یا ویسے خیال نہیں رہا تھا۔ اسی لیے زارون نے خود کھاتے ہوئے نہ صرف اپنا چہرہ خراب کر رکھا تھا بلکہ بہت سا ٹرائفل کپڑوں پر بھی گرا رکھا تھا۔ ہارون نے اٹھتے ہی نیپکن لے کر اس کے ہونٹ اور ٹھوڑی صاف کی اور اماں کو پکارتے ہوئے اس کی شرٹ کو بھی صاف کرنے لگے۔ زارون نے بھائیان کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تو خواہ مخواہ ہی منہ کھول کر بے ہنگم انداز میں ہنسنے لگا تھا اور ثانیہ جو بالکل غیر ارادی طور پر اس کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی ایک دم ہی کرسی دھکیل کر اٹھی اور بھاگتی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔ یہ منظر دیکھ کر اس کا دل ایک دم ہی الٹنے لگا تھا۔ ہارون نے ایک کڑی نگاہ بھاگتی ہوئی ثانیہ پر ڈالی اور پھر تقریباً

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

دھاڑتے ہوئے اماں کو پکارنے لگے۔ اماں بے چاری حواس باختہ سی بھاگتی چلی آئیں۔

"اماں! کم از کم کھانا تو ڈھنگ سے کھلا دیا کریں اسے۔" وہ اماں پر خواہ مخواہ ہی ناراض ہونے لگے۔

"بیٹا! میں تو بس یانی..." وہ منہ ہی منہ میں وضاحت کرنے لگیں۔ جواباً" ہارون ہاتھ میں پکڑا نیپکن ٹیبل پر پھینک کر دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ انہیں ثانیہ کا رویہ درحقیقت بری طرح کھل رہا تھا۔ زارون بھائیان کی ڈانٹ پر سہم سا گیا تھا اور اب چپ چاپ پلکیں جھپکتے ہوئے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ہارون کی اٹھتی گرتی نظریں اس پر پڑیں تو انہیں ایک دم ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا جس پر وہ جبرا" مسکرا دیے۔

"آئم ساری۔ لیکن بیٹا! میں نے آپ سے تو کچھ نہیں کہا۔ آپ کھائیں ناں؟"

ان کے ایک ہی جملے سے زارون خوش باش ہو گیا تھا اور پھر جتنی دیر زارون ڈائننگ ٹیبل پر موجود رہا وہ اس کے سامنے بیٹھے خاموش نظروں سے اسے تکتے رہے اور پھر اماں کو کافی کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئے اور کافی دیر تک ٹھنڈے دماغ سے سوچنے پر احساس ہوا کہ ثانیہ کا بھی اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔

وہ زارون سے تقریباً سات آٹھ سال بڑے تھے۔ لیکن جوں جوں وہ سمجھ بوجھ کی منزلیں طے کرتے گئے انہیں یہ احساس ہو تا گیا کہ زارون کا ان کے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں اور اس کی شخصیت ایسی ہے کہ لوگ اس سے ہمدردی تو کر سکتے ہیں محبت اور چاہت نہیں دے سکتے۔ سو انہوں نے اپنی تمام تر محبت اسے دی تھی۔ ایک بیٹے کی طرح چاہا تھا اسے۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھا تھا۔ سو اتنی محبت میں کراہت، نفرت یا گریز کو جگہ کہاں ملتی؟ وہ ان کا سگا بھائی تھا اور زارون کے ساتھ ان کا خون کا رشتہ موجود تھا۔

اور ثانیہ! ثانیہ کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔

نہ خون کا، نہ محبت کا، نہ دوستی کا، نہ چاہت کا رشتہ، صرف ایک نکاح کا رشتہ تھا۔ ایک کاغذی بندھن، جو عام حالات میں ایک لڑکی کے لیے تمام رشتوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ مگر ان حالات میں تو شاید ثانیہ اس رشتے کو تسلیم بھی نہیں کر سکی تھی۔ وہ آج بھی ان سب کے لیے غیر تھی، اجنبی تھی، وہ باہر سے آئی ہوئی لڑکی تھی۔ اتنی جلدی اس سے بہترین رویے کی توقع رکھنا یقیناً" حماقت تھی مگر اس کے باوجود ہارون کو رہ رہ کر یہ سوچ پریشان کر رہی تھی کہ انہوں نے ثانیہ کو اس گھر میں لا کر غلطی تو نہیں کی؟

فوری طور پر نہ سہی مگر کیا آئندہ وہ ان کے مطلوبہ رویے کو اپنا سکے گی؟ زارون ہمیشہ اس کی نفرت کا شکار رہے گا یا اس کے دل میں اپنے لیے کوئی نرم گوشہ بیدار کر سکے گا؟

ان کا ذہن ایک کے بعد دوسری سوچ میں الجھتا رہا اور رات دھیرے دھیرے سرکتی رہی۔

♥ ♡ ♡ ♥

ثانیہ کو محسوس ہوا تھا جیسے اچانک ہی اس کے سینے پر بے تحاشا بوجھ آ پڑا ہو۔ کچھ دیر وہ یونہی غنودگی میں پڑی رہی مگر جب یہ احساس بڑھتا ہی گیا تب اچانک اس کی آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھیں۔ چند لمحے لگے تھے سوئے ہوئے حواس بیدار ہونے میں اور پھر جونہی شعور پوری طرح جاگا وہ گڑبڑا کر رہ گئی تھی۔

اگلا پل اسے شدید گھبراہٹ سے دوچار کر گیا تھا۔ زارون کا بھاری بازو اس کے سینے پر پڑا تھا اور سر اس کے شانے کو چھو رہا تھا۔ صورتحال کا ادراک ہوتے ہی اس کے پورے جسم میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا تھا۔ تکیے سے سر اٹھا کر اس نے نائٹ بلب کی خوابناک روشنی میں بغور زارون کا چہرہ دیکھا مگر وہاں نیند کا غلبہ تھا۔

گویا نیند کے دوران کروٹ بدلتے ہوئے غیر ارادی طور پر ہی زارون کا بازو اس کے سینے پر آ پڑا تھا۔ اپنی اتھل پتھل سانسوں کو ہموار کرتے ہوئے اس نے زارون کا بازو پیچھے ہٹایا۔ اس کے سر کو ذرا سا سرکا کر اپنے شانے کو آزاد کرواتے ہوئے وہ ایک جھٹکے سے

۲۲۷

اٹھ بیٹھی تھی۔ گہری گہری سانسیں لے کر اس نے اپنے بے تحاشا دھڑکتے دل کو سنبھالا۔ حلق میں الگ کانٹے سے چبھنے لگ گئے تھے۔ بدن کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے وہ بیڈ سے نیچے اتر آئی تھی۔ لائٹ جلا کر روم ریفریجریٹر سے پانی کی بوتل نکال کر اس نے لبوں سے لگائی تو پھر غٹا غٹ پانی چڑھاتی چلی گئی۔

اچھی خاصی خنکی تھی مگر اسے اپنے مساموں سے پسینے کے قطرے پھوٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اپنی آستین سے ماتھے پر آیا پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے پانی کی بوتل واپس رکھی۔ کندھے پر لٹکتا دوپٹہ کھینچ کر کرسی پر پھینکا اور پھر عقبی لان میں کھلنے والی کھڑکی کھول کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ بہت عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی اس کی۔

اس کے کنوارے بدن نے پہلی بار کسی مرد کے لمس سے آشنائی حاصل کی تھی اور مرد بھی کوئی غیر نہیں اس کا اپنا شوہر تھا۔ مگر پھر بھی اسے یہ سب بہت عجیب لگ رہا تھا۔ ہاں مگر ناگوار نہیں۔ اسے اپنے شانے پر اب بھی گرم گرم سانسوں کی حدت محسوس ہو رہی تھی اور سینے پہ جیسے ابھی بھی کوئی انجانا بوجھ دھرا تھا۔

اس نے طویل سانسیں لیتے ہوئے چور نگاہوں سے زارون کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی بھی اسی زاویے میں سو رہا تھا۔ خوبصورت چہرے پر ازلی معصومیت کا راج تھا۔ سیاہ گھنے بالوں نے کشادہ پیشانی کو چھپا رکھا تھا۔ سیاہ پلکیں آپس میں جڑی ہونے کے باوجود دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں۔ تیز روشنی میں اس کے چہرے پر شیو کی نیلاہٹیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ وہ بے خود سے انداز میں اٹھ کر اس کی طرف بڑھ آئی۔ بیڈ کے کنارے پر ٹکتے ہوئے بے تحاشا دل چاہا تھا کہ وہ دھیرے سے اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو ہٹا دے مگر نجانے کیوں وہ جھجک سی گئی۔

"وہ ایک ابنارمل انسان ہے۔ نہ اسے احساس ہے نہ ادراک اور میں۔۔۔" اسے اپنی جذباتی کیفیت پر بے پناہ خجالت محسوس ہوئی تھی۔ چند لمحے وہ یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر اس نے سوچا اب شاید وہ دوبارہ اس کے برابر نہیں سو پائے گی۔ کچھ دیر تذبذب کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے صوفے پر سونے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اپنا تکیہ اٹھانے سے پہلے اس نے زارون کا بازو تکیے پر سے ہٹایا تو نظریں بھٹکتی ہوئی اس کے ہاتھ پر جا رکی تھیں۔ سرخ پوروں والا سفید ہاتھ جسے سیاہ بالوں کے ہلکے روئیں نے مزید خوبصورت اور دلکش بنا دیا تھا۔ اپنا تکیہ اٹھاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اسے دیکھا جو ہنوز غافل پڑا تھا اور پہلی بار۔۔۔ اس تمام عرصے میں پہلی بار اس نے سوچا تھا۔

"کاش۔۔۔ کاش زارون۔۔۔ تم ایسے نہ ہوتے۔۔۔"

اس کی آنکھوں میں دھند سی اترنے لگی تھی جسے اپنی ہتھیلیوں سے رگڑتے ہوئے اس نے لائٹ بجھا دی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

ہارون کی طبیعت کچھ ناساز تھی سو وہ آج بے وقت ہی گھر چلے آئے تھے۔ زارون انہیں کوریڈور میں ہی مل گیا تھا۔

"ہیلو بھائیان!"

ہارون جو اپنی ہی دھن میں آگے بڑھے جا رہے تھے عقب سے اسی کی آواز سن کر ٹھٹک گئے۔

"ہیلو! کہاں سے آ رہے ہیں جناب؟" انہوں نے ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی اور بغور اس کا سراپا جائزہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

وہ ننگے پاؤں تھا۔ شرٹ کی آستین نجانے کس طرح پھٹ کر لٹک رہی تھی۔ بال گرد آلود اور بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اتنا ابنارمل تھا نہیں جتنا اس وقت لگ رہا تھا۔ ہارون کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ یکلخت ہی غائب ہو گئی تھی۔

"میں۔۔۔ وہ۔۔۔ ادھر لان میں تھا۔" زارون نے بازو جھلاتے ہوئے جواب دیا۔

"اماں وزیراں کہاں ہیں؟"

"اماں۔۔۔؟" وہ اپنے بال کھجانے لگا تھا یعنی قطعی لاعلمی کا اظہار۔

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

"اشرف۔" انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے ملازم کو پکارا تھا اور یہ پکار بھی کسی دھاڑ سے مشابہ تھی جو یقیناً" ثانیہ کے کمرے تک بھی پہنچی تھی۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔ بری طرح چونک گئی۔

"لگتا ہے پھر کسی کی شامت آئی ہے۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا اور چونکہ شامت بلاوجہ نہیں آتی تھی اس لیے وہ وجہ معلوم کرنے کے لیے ہی اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی مگر لاؤنج کا منظر دیکھ کر وہ دروازے پر ہی رک گئی تھی۔ تینوں ملازم سر جھکائے کھڑے تھے اور ہارون کے غیض و غضب کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ چہرہ غیر معمولی طور پر سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں جیسے برس جانے کو بے تاب۔ ثانیہ کو اس کے لہجے میں غصے کے ساتھ دکھ کا عنصر بھی محسوس ہوا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا' وہ کون سے ایسے کام ہیں جو زارون سے زیادہ اہم ہو سکتے ہیں۔ آپ لوگوں کو تنخواہ کس کام کی ملتی ہے؟ گھاس کھودنی پڑتی ہے؟ باہر کے کام ہیں آپ کے ذمے؟ یا پھر یہ سارا گھر آپ نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے؟ آپ کو یہاں ملازمت دی گئی اس ذمے داری کے ساتھ کہ زارون جوں ہی کوریڈور کی حد پار کرتا ہے آپ میں سے کوئی نہ کوئی اس کے ساتھ ہو۔ بعض اوقات گیٹ کھلا ہوتا ہے زارون گیٹ سے باہر جا سکتا ہے یا خدانخواستہ اسے کوئی اور نقصان پہنچ سکتا ہے۔ آج لاج کی باڑھ سے اس کی شرٹ کا بازو ادھڑ گیا کل لوہے کی وہ تاریں اس کے بازو کا گوشت ادھیڑ کر رکھ دیں گی تب کیا کر سکیں گے آپ لوگ۔ دو ماہ بعد اماں وزیراں مارکیٹ گئی ہیں اور آپ کی ذمے داری کا یہ عالم ہے یعنی اگر اماں پوچھ گچھ کرنے کے لیے موجود نہ ہو تو زارون اس گھر میں لاوارثوں کی طرح پھرتا رہے گا۔ ایک بات کان کھول کر سن لیں۔ میں ہر معاملے میں ہر کوتاہی کو برداشت کر سکتا ہوں۔ لیکن زارون کے معاملے میں کوئی غفلت' کوئی کوتاہی' کوئی لاپروائی میں ہرگز ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔ یہ میری پہلی اور آخری وارننگ ہے۔ اس کے بعد اگر کچھ ایسا ہوا تو میں کھڑے کھڑے آپ کو نکال باہر کروں گا۔ ناؤ گیٹ لاسٹ فرام ہیئر۔"

تینوں ملازم دم سادھے کمرے سے باہر نکل گئے تھے اور وہ وہیں صوفہ چیئر پر گر سے گئے تھے۔ کچھ دیر یونہی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے خود کو نارمل کرتے رہے اور پھر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگے۔

"دینو بابا۔۔۔ پانی لے کر آؤ۔" انہوں نے ہلکی سی آواز میں پکارا تھا۔ ثانیہ ان کے لہجے و انداز میں تھکاوٹ محسوس کیے بنا نہیں رہ سکی تھی۔ ہارون اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھے تو ثانیہ بھی فوراً وہاں سے کھسک آئی۔ کمرے میں آ کر اسے احساس ہوا کہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور ہاتھ سرد ہو رہے تھے۔ وہ لاشعوری طور پر خود کو ان ملازمین کی قطار میں کھڑا محسوس کر رہی تھی جنہیں ابھی ابھی زبردست قسم کی جھاڑ پڑی تھی۔ اسے بھی تو اسی مقصد کے لیے یہاں لایا گیا تھا اور حیرت کی بات یہ کہ ابھی تک اس کی ہر کوتاہی بڑی آسانی اور کمال مہربانی سے نظرانداز کر دی گئی تھی۔

"اور اگر جو کبھی مجھے بھی اس قطار میں لا کھڑا کر دیا گیا تو۔۔۔؟" وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔ وہ ایک خوف جو بچپن سے اس کے دل میں پڑا تھا ایک دم سے پورے وجود میں سرایت کر گیا تھا۔

"زارون!۔" اس نے کچھ سوچ کر زارون کو پکارا جو اپنے کھلونوں کی الماری کھنگال رہا تھا۔

"ہوں۔"

"زارون! تمہارے کپڑے بہت خراب ہو رہے ہیں' تم نہالو' میں تمہارے کپڑے نکالتی ہوں۔"

اماں وزیراں کے انداز میں اس نے کہا تو وہ خلاف توقع بڑی جلدی مان گیا۔ اسے واش روم میں بھیج کر اس نے اس کے کپڑے نکال کر بیڈ پر پھیلا دیے اور بلند آواز میں زارون کو اطلاع دے کر خود باہر آ گئی۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد زارون باہر نکلا تو وہ چڑ کر رہ گئی۔

زارون نے شرٹ الٹی پہن رکھی تھی اور بالوں سے بھی قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا۔

"ادھر آؤ تم۔" ثانیہ نے اسے شرٹ کے بازو سے پکڑ کر دوبارہ بیڈ روم میں کھینچ لیا۔

"کیا ہے تمہیں؟" اپنا بازو چھڑاتے ہوئے زارون اس کے انداز پر الجھ گیا تھا۔ ثانیہ نے اسے بگڑتے دیکھ کر فوراً ہی خود پر قابو پایا اور میٹھے لہجے میں بات کرتے ہوئے اسے بیڈ روم میں لے آئی۔

"زارون! تم نے شرٹ الٹی پہن لی ہے۔"

"ایسے ہی ٹھیک ہے۔" وہ باہر جانے کو پلٹا تو ثانیہ فوراً اس کے سامنے آ گئی۔

"اچھا بس ایک منٹ رکو۔" اس نے فوراً سے پیشتر اس کی شرٹ کے بٹن کھول کر شرٹ اتاری اور سیدھی کر کے زارون کو پہننے میں مدد دی اور پھر اسے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے لا بٹھایا۔ تولیہ لے کر اس کے گیلے بالوں کو قدرے خشک کیا اور برش اٹھا کر اس کے بکھرے بال سنوارنے لگی۔ یہ سب کرنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ کر رہی تھی۔ بال بنا کر اس نے پرفیوم اسپرے کرنا چاہا تو زارون نے پرفیوم اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"میں خود ہی کروں گا۔" وہ خوشبو کی پھوار میں بھیگنے لگا پھر ایک نظر ثانیہ پر ڈالی۔ شرارت سے مسکرایا اور پرفیوم کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ ثانیہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا سو وہ یکلخت ہی دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"زارون! نہیں کرو۔" چونکہ حملہ بہت اچانک ہوا تھا اس لیے وہ فوری طور پر خود کو بچا نہ سکی تھی۔ پہلا اسپرے ہی چہرے پر ہوا تھا۔ آنکھیں بھی محفوظ نہیں رہ سکی تھیں۔ بے تحاشا جلن کا احساس ہوتے ہی اس نے کئی قدم پیچھے ہٹتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔

"زارون پلیز بس کرو۔" وہ چلائی تھی مگر زارون کو شاید یہ عمل زیادہ ہی لطف انگیز لگا تھا' سو کھلکھلا کر ہنستا چلا جا رہا تھا۔ اس کی اس بے تکی حرکت یا شاید اپنی بے بسی پر ثانیہ کے وجود میں غصہ سا ابھر گیا تھا۔

"زارون! بند کرو یہ حرکت ورنہ میں۔۔۔" پیچھے ہٹتے ہوئے وہ اچانک ہی دیوار سے جا لگی تھی اور زارون مسکراتے ہوئے بڑی مستقل مزاجی سے اس کے وجود کو خوشبو میں بھگوتا جا رہا تھا۔ ثانیہ کو لگا وہ پوری شیشی ختم کر کے ہی دم لے گا مگر بے تحاشا خوشبو نے اس کا دماغ ہی گھما ڈالا تھا۔ مزید برداشت کی ہمت نہ رہی تو وہ سب احتیاط پس پشت ڈال کر زارون پر جھپٹی اور اگلے ہی لمحے پرفیوم اس کے ہاتھ سے چھین کر اس نے پوری قوت سے دیوار پر کھینچ مارا تھا۔

زارون اپنی جگہ دنگ سا رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ثانیہ کا دل چاہا وہ اس پر بری طرح ٹوٹ پڑے مگر آنکھوں میں ہوتی جلن نے اسے کچھ زیادہ مہلت نہیں دی تھی۔ بس ایک بھرپور شکایتی نظر اس نے زارون پر ڈالی اور دھم سے کرسی پر گر گئی۔ سر جھکا کر اس نے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں رگڑیں جہاں سے جلن ہونے کے ساتھ ساتھ پانی بھی بہہ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اپنے ہونٹوں سے سسکیوں کی آواز سن کر اسے احساس ہوا کہ بہتے پانی میں آنسوؤں کی آمیزش بھی ہو چکی ہے۔

زارون اپنی جگہ چپ چاپ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے پہلے کی مسکراہٹ اس کے چہرے سے غائب ہو چکی تھی۔

"ثانیہ تم۔۔۔ تم رو کیوں رہی ہو؟" اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے اس نے بہت دھیمی آواز میں پوچھا اور ثانیہ کو تو خود بھی اپنے آنسوؤں کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ معلوم نہیں آنکھوں میں تکلیف کی وجہ سے رونا آیا تھا یا غصے اور بے بسی کے احساس کے تحت۔

"ثانیہ۔۔۔ ثانیہ۔۔۔! مت روؤ۔" زارون بہت آہستگی سے اس کا بازو ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ثانیہ نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے سر اٹھا کر ذرا کی ذرا اس کی طرف دیکھا۔ وہ کرسی کے پاس قالین پر بیٹھا ہوا تھا' بہت سہما اور ڈرا ہوا۔

"نہیں روؤ۔۔۔ ثانیہ۔۔۔!" اس نے جیسے التجا کی تھی۔

"زارون تم جاؤ یہاں سے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ زارون جیسے نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگا۔

"لیکن تم تو رو رہی ہو اور جب تم روتی ہو تو اماں تمہیں چپ کرواتی ہیں۔ میں بھی تمہیں چپ کروا رہا ہوں۔" وہ اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر تھپکنے لگا۔ اس نے بارہا اماں کو اسے اسی طریقے سے چپ کرواتے دیکھا تھا۔ اس ہمدردی پر ثانیہ بس ایک نظر اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ میں اب چپ کر گئی ہوں۔"

اس نے زارون کا ہاتھ ہٹایا اور خود اٹھ کر واش روم میں گھس گئی۔ آنکھوں پہ پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے اس نے دانستہ دیر لگائی تھی اور جب وہ باہر نکلی تو زارون واقعی کمرے میں نہیں تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

گولڈن فریم کا نہایت نفیس چشمہ اتار کر انہوں نے حسب عادت کھلی فائل پر رکھا اور پھر انگلیوں کی پوروں سے آنکھ کے پپوٹوں کو دباتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ گزشتہ دو روز سے انہیں ٹمپریچر ہو رہا تھا مگر وقت کی کمی کے باعث وہ ڈاکٹر کے پاس نہ جا سکے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ انہوں نے ادھر ادھر کے مسائل میں خود کو اتنا الجھا رکھا تھا کہ اپنی ذات پر توجہ دینے کی عادت ہی نہ رہی تھی۔

اسٹڈی روم لاک کر کے وہ نیچے آئے تو لاؤنج میں روشنی دیکھ کر کچن کی طرف جانے کے بجائے وہیں آ گئے۔

"اچھا کرتی ہو بیٹی! جو زارون میاں میں دلچسپی لینے لگی ہو۔"

"ہونہہ۔۔۔ مجبوری ہے اماں۔۔۔! لاکھوں روپوں کا حق ادا کرنا ہے مجھے۔ بٹھا کر کھلانے کو نہیں لایا گیا ناں مجھے۔۔۔" ثانیہ کے لہجے کی کاٹ نے ان کے اٹھتے قدم روک دیے تھے۔

"تو گویا ابھی تک یہ کیل اس کے دل میں گڑی ہے۔" انہوں نے ایک لحظے کے لیے سوچا اور پھر لاؤنج میں داخل ہو گئے۔

"ابھی تک جاگ رہے ہیں سب لوگ۔" انہوں نے ایک نظر کلائی پر بندھی گھڑی پر ڈالی جس کی سوئیاں ساڑھے گیارہ کے ہندسے پر جگمگا رہی تھیں۔

"ہاں میاں! زارون کا سونے کا ارادہ نہیں' اسی لیے ہم بھی بیٹھے ہیں۔" اماں وزیراں نے خوش دلی سے جواب دیا۔ انہوں نے اپنی نشست سنبھالتے ہوئے ثانیہ کو دیکھا وہ کارپٹ پر بیٹھی زارون کی طرف متوجہ تھی جو اپنے سامنے ڈھیروں بلاکس پھیلائے ان میں پوری طرح گم تھا۔

"اماں! ایک کپ چائے مل جائے گی؟"

"کیوں نہیں۔ میں ابھی لاتی ہوں۔" ہارون کی فرمائش پر وہ اٹھنے کو تھیں کہ ثانیہ نے انہیں روک دیا۔

"میں بنا لاتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی سو اماں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

"ہارون بیٹا! خیریت تو ہے؟ کچھ ست دکھائی دے رہے ہو؟" اماں وزیراں نے بغور ان کا جائزہ لیا۔ قدرے ایزی ہو کر بیٹھتے ہوئے انہوں نے اپنا دایاں بازو سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔ اماں کی بات سن کر انہوں نے بند آنکھوں سمیت مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ در حقیقت وہ سوچ رہے تھے کہ آج ثانیہ سے ضرور ہی بات کریں گے۔ تھوڑی دیر بعد ثانیہ کی آواز پر انہوں نے آنکھیں کھولیں اور پھر فوراً ہی سیدھے ہو بیٹھے۔

"اماں! میرے کمرے میں سائیڈ ٹیبل کی دراز میں سر درد کی گولیاں ہوں گی۔ تھوڑی زحمت کریں اور۔۔۔"

"لو بیٹا زحمت کیسی؟ ابھی لائے دیتی ہوں۔" وہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ثانیہ دوبارہ زارون کے پاس بیٹھ گئی۔ زارون نجانے کب سے بلاکس جوڑ رہا تھا لیکن ہر دفعہ ناکام ہو رہا تھا۔ سو اس نے جھنجلا کر سارے بلاکس نیچے پھینک دیے تھے۔

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

"نہیں بن رہا۔" وہ روہانسا ہو کر چلایا تھا۔ ہارون اور ثانیہ دونوں ہی اپنی جگہ چونک گئے تھے۔

ثانیہ نے ایک نظر زارون کو دیکھا اور پھر سارے بلاکس اپنے سامنے رکھ کر انہیں جوڑنے لگی۔ لمحوں میں ہی لمبی سی ٹرین تیار کھڑی تھی۔

"یہ کیا بن گیا؟" زارون کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

"ٹرین بن گئی۔"

"ٹرین کو کیا کرتے ہیں؟"

"سفر کرتے ہیں ٹرین میں بیٹھ کر۔" ثانیہ نے مختصراً جواب دیا۔

"سفر کیا ہوتا ہے؟"

"پتا نہیں۔"

اماں وزیراں کے ہاتھ سے گولی لے کر نگلتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر زارون اور ثانیہ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"ہم بھی اس میں بیٹھیں گے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟" جواب ندارد تھا۔

"ہم۔۔۔ ہم اس میں بیٹھیں گے۔ ہم کہاں جائیں گے؟"

"پتا نہیں۔"

ہارون نے محسوس کیا کہ ثانیہ کا رویہ کھنچا کھنچا سا تھا اور لہجے میں بیزاری در آئی تھی۔

"ثانیہ! اگر تم ایک بار اطمینان سے اسے بات سمجھا دو گی تو وہ بار بار تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ ثانیہ ان کی آواز پر ایک لمحے کے لیے انہیں دیکھا تھا اور پھر لب بھینچ کر سر جھکا لیا تھا۔

ہارون نے خالی کپ تپائی پر رکھا اور پھر قدرے آگے کو جھکتے ہوئے وہ ثانیہ کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئے تھے۔

"دیکھو ثانیہ! تم زارون کو ایک عام فرد کی نگاہ سے مت دیکھا کرو۔ تم اس کی بیوی کی حیثیت سے اس گھر میں آئی ہو لہٰذا اب زارون کی ذمہ داری ہم سب سے زیادہ تم پر عائد ہوتی ہے کیونکہ یہاں رہنے کا آخری فیصلہ تو بہرحال تمہارا اپنا تھا۔" ان کی آخری بات پر ثانیہ نے کاٹ دار نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"جی ہاں۔ آپ لوگوں نے تو اڑان بھرنے کی اجازت دے دی تھی، مجھے 'پر کاٹ کر۔" اس نے نظریں جھکا کر بڑے اطمینان سے طنز کیا تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہے اور پھر طویل سانس لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں مانتا ہوں تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ بڑا ظلم ہوا ہے تم پر مگر ظالم یا تو میں ہوں یا کمال احمد۔ زارون تو اس پورے معاملے میں بالکل بے قصور ہے۔ وہ تو تم پر بہت حق رکھتا ہے۔ چلو بیوی کی حیثیت سے نہ سہی انسان ہونے کے ناتے سے تو تم اسے وہ محبت اور چاہت دے سکتی ہو نا جو اس کے لیے بہت ضروری ہے۔ ثانیہ! ڈاکٹر نے کہا ہے کہ بے تحاشا توجہ اور بے پایاں محبت زارون کو نارمل کر سکتی ہے۔ تم اسے اپنی محبت دو اور پھر اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھنا اس کی آنکھیں اس محبت کا جواب دیتی ہوئی محسوس ہوں گی۔"

"ہارون صاحب! میں اتنا ہی کر رہی ہوں جتنا انسان ہونے کے ناتے کر سکتی ہوں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ لاکھوں زہر میں بجھے تیر جو میرے دل میں گڑے ہیں، وہ مجھے اس گھر میں اپنی حیثیت، اپنے مرتبے کا تعین ہی نہیں کرنے دیتے۔ ہارون صاحب! باندی بیوی نہیں بن سکتی اور بیوی خریدی نہیں جا سکتی۔ تو پھر میرا رتبہ اس گھر میں کیا ہے؟

میں ملازموں کی قطار میں کھڑی ہوں تو زارون سے تعلق مجھے ان سب سے ممتاز کر دیتا ہے، میں بیوی بن کر زارون کے برابر کھڑی ہوں تو وہ آٹھ لاکھ مجھے اس سطح سے نیچے دھکیل دیتے ہیں۔ میں کیا کروں؟ لونڈی بن کر زارون کے قدموں تلے بچھ جاؤں یا بیوی بن کر اسے محبت کے آنچل میں سمیٹ لوں۔ آخر کس نظر سے دیکھوں میں اسے؟" ثانیہ لرزتی آواز میں دل کی

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

ساری بھڑاس نکالتی چلی گئی۔

آنکھیں تھیں کہ برس جانے کو تیار۔ خود کو سمیٹنا مشکل ہو رہا تھا سو وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ہارون جو دریچے میں کھڑے لان میں بکھری رات کی سیاہی کو کھوج رہے تھے آہٹ کی آواز پر وہ چونک گئے۔ انہوں نے اس کی پوری بات نہایت اطمینان اور توجہ سے سنی تھی۔

"ثانیہ! ابھی بیٹھو کچھ دیر۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" وہ سر میں اٹھتی درد کی لہروں سے بے نیاز ہو کر اس کی طرف پلٹے تھے۔

"مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔" اس نے فوراً ان کی طرف سے رخ موڑ لیا۔ وہ ان کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی مگر آنسو گالوں پر پھسلتے چلے گئے تھے۔ اس کے اکھڑ اور خفا خفا سے لہجے پر وہ بے اختیار ہی ہولے سے مسکرا دیے۔

"بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ بیٹھ کر آرام سے وہ سنو جو میں کہنے جا رہا ہوں۔"

"بچوں جیسی باتیں تو بچپن میں نہیں کی تھیں اب کیا خاک کروں گی۔" وہ صوفے پر بیٹھ تو گئی تھی مگر کہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ ہارون اسے ایک نظر دیکھ کر رہ گئے۔

وہ کم عمر تھے مگر حالات و واقعات کو جانچنے اور پرکھنے کی نگاہ عمر رسیدہ ہو چکی تھی اور ان سے زیادہ کون جان سکتا تھا کہ بچپن میں بڑھاپا اوڑھنے والوں کے وجود میں کتنی حسرتیں پنپتی ہیں اور کتنی خواہشیں گھر کرتی ہیں۔

وہ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ثانیہ تک آئے۔ کچھ لمحے زارون کو دیکھتے رہے۔ جس کی آنکھوں میں نیند پوری طرح سما چکی تھی پھر اسے اس کے کمرے تک پہنچا آئے۔ اماں وزیراں پہلے ہی جا چکی تھیں۔ سو وہ بہت اطمینان کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھے اور ساری بات کھول کر اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ کبھی بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہی کبھی انگلیاں چٹخاتے ہوئے اپنے آپ میں الجھتی رہی۔

"تم اگر کہتیں تو میں کمال احمد سے ایک ایک پائی وصول کر لیتا مگر مصیبت یہ ہے کہ میں انہیں زبان دے چکا ہوں اور پھر کمال احمد پر ہی کیا موقوف چند اور لوگ بھی ایسے ہیں جنہیں میں نے کچھ رقم بطور قرض دے رکھی ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ یہ رقم مجھے واپس کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ تم اسے میری کمزوری ہی سمجھ سکتی ہو کیونکہ اپنے سامنے کسی بھی پھیلے ہوئے ہاتھ کو خالی لوٹا دینا میرے لیے ممکن نہیں وہ بھی اس صورت میں کہ روپے میرے پاس موجود ہوں۔

اور یوں بھی ثانیہ! اگر تم غور کرو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ ہمارے معاشرے میں بعض لوگ غربت و افلاس کے ہاتھوں اس قدر بے بس و مجبور ہو گئے ہیں کہ اگر میں کسی غریب کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو وہ زارون کی حالت سے باخبر ہوتے ہوئے بھی اپنی بیٹی اس سے بیاہنے پر راضی ہو جاتے کیونکہ ان کی بیٹی اچھا کھائے، اچھا پہنے اور ایک محفوظ پناہ گاہ میں رہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں کوئی فرد اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی لڑکی کے حصول کے لیے لاکھوں کی رقم ڈبو دے۔ تم اس گھر میں آئی ہو تو صرف اس وجہ سے کہ ہم سے پہلے کاتب تقدیر نے تمہارا اور زارون کا جوڑ لکھ چھوڑا تھا۔ اب بتاؤ بات سمجھ میں آئی جو میں کہہ رہا ہوں۔" انہوں نے ثانیہ کی کھلی آنکھوں میں جھانکا تو وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

"آپ جھوٹ تو نہیں بول رہے ناں؟" اس کے انداز میں معصومیت تھی۔

"کیا تم سمجھ سکتی ہوں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" انہوں نے جلتی ہوئی آنکھیں بمشکل کھول کر اس سے سوال کیا تو وہ مزید الجھ گئی۔

"مگر اتنی بڑی رقم۔۔۔ بطور قرض اور وہ بھی ناقابل واپسی۔۔۔!" اسے کسی طور یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"ثانیہ! کیا تم نے اپنے سسرال والوں کو اتنا کنگال سمجھ رکھا ہے۔ خدا کا اتنا فضل ہے ہم پر کہ دونوں

133

ہاتھوں سے لٹانا شروع کریں تو بھی کمی واقع نہ ہو۔" ان کے قدرے بشاش لہجے پر وہ انہیں بس دیکھتی رہی تھی۔

"او کے اب تم سو جاؤ۔ کوئی اور بات رہ گئی ہو تو صبح کہہ دینا۔ مجھے یقین ہے کہ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ہارون کی بات کبھی اسے سچ لگ رہی تھی کبھی جھوٹ۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ ذہن پر سے بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور اس رات وہ قدرے اطمینان سے سوئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ بے حد گہری نیند میں تھی مگر اس کے باوجود کچھ ایسا ہوا تھا کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی اور اس کوشش میں صوفے سے گرتے گرتے بچی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" اس نے دھڑدھڑاتے دل کے ساتھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی غیر معمولی صورت حال سے آگاہ کر رہی تھی۔ مدھم لائٹ کی روشنی میں اس نے بغور سوئے ہوئے زارون کی طرف دیکھا اچانک ہی اسے لگا کہ زارون کا جسم ہلکے ہلکے جھٹکے کھا رہا ہے۔ غالباً" نیند سے اٹھنے کے باعث اسے لگا کہ وہ ٹھیک سے نہیں دیکھ پا رہی ہے۔ سو اس نے لپک کر پہلے ٹیوب لائٹ روشن کی تھی اور پھر جوں ہی اس نے پلٹ کر بیڈ کی طرف دیکھا۔ واضح ہوتے منظر نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں اور حلق سے بے اختیار چیخ برآمد ہوئی تھی۔

زارون کا سارا جسم زور زور سے جھٹکے کھا رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں بے تحاشا مڑ گئے تھے۔ اس کے جبڑے غیر معمولی طور پر بھنچ گئے تھے اور آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی تھیں۔ حلق سے تکلیف کی شدت سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے نادیدہ زنجیروں میں جکڑ کر مخالف سمتوں میں کھینچا جا رہا ہو۔ اس کی اس حالت نے ثانیہ کے حواس جیسے بھک سے اڑا دیے تھے۔ وہ گھبرا کر ایک دم آگے بڑھی پھر فوراً ہی کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ زارون کی خوفناک حد تک بگڑتی حالت نے اسے بری طرح متوحش کر دیا تھا۔

"کوئی ہے۔۔۔ اماں۔۔۔! ہارون۔۔۔!" وہ پوری قوت سے چلائی تھی مگر اسے لگا اس کی آواز حلق سے باہر نہیں نکل پائی۔ وہ یونہی چیخ چیخ کر انہیں پکارتی ہوئی باہر نکلی تو تاریک راہداری میں اسے کچھ سمجھ میں ہی نہ آیا تھا کہ ہارون کا کمرہ کس طرف ہے۔

"کوئی ہے۔ خدا کے لیے جلدی آ جاؤ۔ ہارون۔۔۔! ہارون۔۔۔!" اس نے زور زور سے چلاتے ہوئے برابر کے کمرے کا دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔ دروازہ کھلنے میں چند لمحے لگے تھے مگر ثانیہ کی جیسے ساری توانائیاں اسی کوشش میں خرچ ہو گئیں۔

"زارون کو۔۔۔ زارون کو پتا نہیں کیا ہو گیا؟" ہارون کے بوکھلائے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس نے کہا تھا۔ ہارون نے اس کی پوری بات سنے بغیر ہی اسے ایک طرف دھکیلا اور برق رفتاری سے زارون کے کمرے میں گھس گئے۔

زارون کو پڑنے والا دورہ اس قدر شدت اختیار کر گیا تھا کہ تڑپتے تڑپتے اس کا آدھا دھڑ بستر سے نیچے لٹک گیا تھا۔ ہارون نے فوراً سے پیشتر اسے سنبھال کر بیڈ پر ڈالا تھا اور اس کے پھڑپھڑاتے جسم کو قابو کرنے لگے تھے۔ کسی جانور کو رسیوں سے جکڑ کر کند چھری سے ذبح کرنے پر جو حالت ہو سکتی تھی ایسی ہی حالت زارون کی تھی اور ثانیہ کے لیے اس حد تک غیر متوقع تھی کہ وہ پوری طرح سانس بھی نہیں لے پا رہی تھی۔

"ثانیہ۔۔۔ ٹیبلٹس! نکالو۔" ہارون کی آواز پر وہ مزید بوکھلا گئی تھی۔

کون سی ٹیبلٹس، کیسی ٹیبلٹس۔ اس کے تو فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا۔ تب ہی ہارون کی عقل بروقت کام کر گئی۔ انہوں نے بجلی کی سی تیزی سے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھینچی تھی اور نہایت عجلت سے ایک شیشی نکال کر اس کے ہاتھوں میں دی تھی۔ اس

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

عالم میں ان کے ہاتھ بھی کپکپا رہے تھے۔

"ایک گولی پیس کر پانی میں ملا کر لاؤ۔"

وہ شیشی ہاتھ میں دبوچ کر کچن کی طرف بھاگی۔ پہلے راہداری میں کسی چیز سے ٹھوکر لگی پھر کچن کے بند دروازے سے جا ٹکرائی۔ بمشکل ڈھونڈ ڈھانڈ کر کچن کی لائٹ جلائی۔ گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ ایک چمچ نکالنے کی کوشش میں پورا کٹلری سیٹ زمین پر آرہا تھا۔ کپکپاتے ہاتھوں سے گولی نکالی تو وہ پوروں کے بیچ سے نکل کر نجانے کہاں گر گئی۔

اس نے ڈھونڈنے کی کوشش کیے بغیر دوسری گولی نکال کر سلیب پر رکھی اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بیلن لے کر ہی گولی کو چور چور کر ڈالا۔ اسے کپ میں ڈال کر ایک گھونٹ پانی ملایا اور اسی تیز رفتاری سے واپس بھاگ گئی۔ اس کے پیچھے ریفریجریٹر کھلا رہ گیا تھا۔ پانی کی بوتل زمین پر اوندھی پڑی تھی اور پورا پانی فرش پر بکھر گیا تھا۔

وہ بیڈ روم میں پہنچی تو اماں وزیراں بوکھلائے سے انداز میں باہر نکل رہی تھیں۔ اسے آتے دیکھ کر اس کے ہاتھ سے کپ اور چمچ لے کر دوبارہ اندر چلی گئیں۔ اس نے کھلے دروازے سے بس ایک نظر اندرونی منظر پر ڈالی اور پھر وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ زارون کے حلق سے نکلتی خرخراہٹوں کی آواز ابھی بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے اور دیوار کے ساتھ گھسٹتی ہوئی زمین پر بیٹھ گئی اس کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا تھا۔

"یااللہ! رحم کردے۔ اے پروردگار اپنا کرم کردے۔" اس کے لبوں سے بے اختیار دعائیں جاری ہو گئیں۔ نجانے کتنی دیر وہ یونہی گھٹنوں میں سر دیے چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔ پھر اٹھ کر کمرے میں آگئی۔ بہت ڈرتے ڈرتے اس نے آگے بڑھ کر جھانکا تھا۔ زارون کی کیفیت پہلے جیسی نہ تھی مگر پھر بھی سارے جسم میں کھنچاؤ اور اکڑاؤ سا دکھنے میں آرہا تھا۔ اماں اس کے سرہانے بیٹھی آیات پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ ہارون نے پہلے اس کا لباس درست کر کے کمبل اس پر ڈالا اور پھر دھیرے دھیرے زارون کے ڈھیلے پڑتے ہاتھوں کو سہلانے لگے۔

دورے کے دوران زارون کا نچلا ہونٹ غالباً دانتوں تلے آگیا تھا لہٰذا وہاں کٹ سا لگ کر خون بہہ رہا تھا۔ ہارون نے خون صاف کر کے اس پر کوئی دوائی لگائی۔ اس کی نبض چیک کی اور پھر صوفے پر آکے ڈھے سا گئے۔ اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے انہیں اپنی حالت قابل رحم سی لگی تھی۔ ایک تو طبیعت کی خرابی' اس پر کچی نیند سے اس گھبراہٹ کے عالم میں جاگے تھے کہ کتنی ہی دیر تک کچھ سجھائی نہ دیا تھا اس پر زارون کی حالت نے ان کے ہاتھ پاؤں مزید پھلا دیے تھے۔ چند لمحے بعد انہوں نے سر اٹھا کر زارون کو دیکھا وہ بے سدھ لیٹا ہوا تھا۔ پھر وہ ثانیہ کی طرف متوجہ ہو گئے جو پریشان و متفکر چہرہ لیے کرسی پر ٹکی ہوئی تھی۔

"ثانیہ! مجھے زارون کے پاس رکنا پڑے گا۔ تم ساتھ والے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔" ان کی بات سن کر اس کی نگاہیں زارون کے چہرے پر جم گئی تھیں۔

"ہی ول بی آل رائیٹ۔ پہلے بھی ایسا ہو جاتا ہے کبھی کبھار۔ صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔ اماں! آپ بھی آرام کریں۔ میں ہوں زارون کے پاس۔" انہوں نے بڑے سبھاؤ کے ساتھ ان دونوں کو وہاں سے اٹھانا چاہا تھا۔

ثانیہ نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا لیکن پھر جھجک کر وہیں بیٹھ گئی۔ اس افراتفری میں اس کا دوپٹہ نہ جانے کہاں رہ گیا تھا۔ اس نے طائرانہ نظر پورے کمرے میں ڈالی تو دوپٹہ وہیں صوفے پر پڑا نظر آیا جہاں وہ سو رہی تھی اور جہاں اس وقت ہارون براجمان تھے۔ ہارون نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور پھر دانستہ اٹھ کر بیڈ کے دوسری طرف جا کر ریفریجریٹر سے پانی کی بوتل نکالنے لگے۔ ثانیہ نے اٹھ کر اپنا دوپٹہ کھینچ کر کندھے پر ڈالا اور اماں کے ساتھ ہی کمرے سے باہر آگئی۔ اماں وزیراں کو بھی ثانیہ نے اسی کمرے میں بلا لیا تھا۔ بقیہ رات آنکھوں میں کٹی

تھی۔ کبھی آنکھ لگی بھی تو عجیب و غریب ڈراؤنے قسم کے خواب آکر ڈراتے رہے۔ رات کی کسی آخری گھڑی میں وہ سوئی تھی لیکن اس کے باوجود جلد ہی آنکھ کھل گئی تھی۔

اماں وزیراں پہلے ہی اٹھ چکی تھیں۔ وہ بیڈ سے اترتے ہی سیدھی زارون کے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔ ہارون اسی کمرے میں نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ دروازے ہی سے زارون کو سوتا دیکھ کر واپس آگئی۔ اماں حسب معمول کچن میں مصروف ہو گئی تھیں۔

"میں تو رات کو ڈر ہی گئی تھی اماں! زارون کی حالت تو دیکھی نہیں جا رہی تھی۔" رات کی سچویشن کا سوچتے ہی وہ کانپ سی گئی تھی۔

"ہاں، تمہاری موجودگی میں تو شاید پہلا دورہ پڑا ہے اسے۔" اماں نے بسکٹ اور چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا۔

"لیکن ہم نے تو اس بچے کے ایسے ایسے دکھ دیکھے ہیں کہ خدا کسی دشمن کو بھی نہ دکھلائے۔" انہوں نے اپنے لیے کپ میں چائے ڈالی اور اس کے سامنے آبیٹھیں۔

"سات، آٹھ سال تک تو بالکل بھلا چنگا تھا۔ پھر ایک روز بخار نے آلیا۔ سب لوگ یہ ہی سمجھے کہ معمولی بخار ہے، دو چار نہیں تو چھ آٹھ دنوں بعد اتر جائے گا۔ ڈاکٹر کو دکھایا، دوائیاں دیں لیکن بخار تو ایسا چمٹا کہ لگا بچے کی جان لے کر ہی چھوڑے گا۔ اسپتال میں داخل کروا دیا گیا، زارون کو۔ ڈاکٹر بھی پریشان تھے بغیر کسی بیماری کے اتنا طویل المیعاد بخار نہ دیکھا نہ سنا۔ کوئی چھ، آٹھ ماہ بعد بخار میں کمی آنے لگی۔ زارون ہاسپٹل سے گھر آگیا۔ سب ہی خوش تھے کہ اچانک رات کو ایسا ہی دورہ پڑ گیا اور اتنی شدت کہ اللہ میری توبہ۔ کچھ لوگ تو سورہ یاسین پڑھنے لگے کہ بس اب وقت آخر ہے۔ ایک بار پھر اسپتال لے کر بھاگے۔ وہاں ساری رات وقفے وقفے سے دورے پڑتے رہے۔ آخری دورہ تو تین چار گھنٹے تک رہا۔

اس کے بعد اس کو کچھ ہوش نہ رہا۔ ایک مہینہ بے ہوشی کے عالم میں گزرا۔ پھر آنکھ کھولی تو نہ سن سکتا تھا نہ بول سکتا تھا۔ حالت ایسی تھی جیسے چند ماہ کا بچہ ہو۔ یہاں ڈاکٹروں نے جان لڑا دی مگر اس کی زبان نہ ہلی۔ پھر بڑے صاحب زارون کو باہر لے گئے، وہاں کئی مہینے علاج ہوتا علاج سے بالکل ٹھیک ہو گیا، لیکن جب دورے پڑتے ہیں تو کئی کئی ماہ تک اسی بچپن کی کیفیت میں رہتا ہے۔ بیگم صاحبہ تو اسی غم میں قبر میں جا پڑیں، میں تو کہتی تھی سب کالے جادو کا کرشمہ ہے، کئی تعویذ بھی لا کر دیکھے مگر شفا دینا تو رب سوہنے کے ہاتھ میں ہے ناں، نہیں معلوم اس کے کاموں میں کیا مصلحت ہے۔ بیماری تو چلی گئی یہ دورے پڑنا بند ہو جائیں تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈاکٹر کہتے تھے اس کی شادی کر دو تو ٹھیک ہو جائے گا۔ بڑی اذیت ہوتی ہے اسے دیکھ کر۔ خدا میرے بچے پر اپنا فضل فرمائے۔ اس کی جان کو سکھ دے۔" اماں وزیراں اپنی آنکھیں رگڑنے لگیں۔ ثانیہ کے حلق میں چائے کا پہلا گھونٹ ہی پھنس کر رہ گیا تھا۔

"نہیں معلوم اس کے کاموں میں کیا بھید ہیں؟"

اور ہم گناہگار انسان ۔۔۔ ہماری زبانیں کفر تولتے نہیں تھکتیں۔

کوئی واقعہ ہو گیا ہے ۔۔۔ کیوں ہو گیا ہے ۔۔۔ اس کے ہونے میں کیا مصلحت تھی؟ کیا راز تھا ۔۔۔؟ ہمیں معلوم نہیں ہوتا۔

بغیر سوچے، بغیر سمجھے اور بغیر جانے ہم شکوے شکایات کا دفتر کھول لیتے ہیں۔

گویا خدا کو (نعوذ باللہ) ایک بے انصاف منصف کی طرح اپنے سامنے کٹہرے میں کھڑا کر دینا چاہتے ہیں۔

اسے ایک اناڑی کاتب سمجھتے ہیں جس نے ہماری تقدیر کی لوح پر کچھ غلط سلط لکھ ڈالا ہو (نعوذ باللہ) محض اس لیے کہ وہ نہیں ہوا جو ہم چاہتے ہیں۔

اور کون جانے جو ہم چاہتے ہیں وہ ہمارے حق میں بہتر ہے بھی کہ نہیں۔

ثانیہ غیر ارادی طور پر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جسم کے ریشے ریشے میں کوئی انجانا سا خوف

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

سر اٹھا رہا تھا۔ اس کا دل اپنے کردہ و ناکردہ گناہوں پر توبہ استغفار کی تسبیح کرنے لگا تھا۔ وہ ہمیشہ انسان سے خوفزدہ ہوتی رہی تھی آج پہلی مرتبہ خدا کی خدائی سے دل کانپا تھا۔

اماں نے اسے اٹھتے دیکھ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا تب ہی دینو بابا چلے آئے۔

"ڈاکٹر علی آئے ہیں۔ ان کے لیے چائے بنا دیں۔ اور ثانیہ بی بی کو صاحب بلا رہے ہیں۔" انہوں نے سلام کرتے ہوئے ان دونوں کو پیغام دیا اور اس کے اثبات میں سر ہلاتے ہی واپس پلٹ گئے۔

"جب تک میں چائے بناتی ہوں تم اپنا حلیہ درست کرلو۔ ڈاکٹر علی' ہارون کے دوست ہیں۔ پہلی دفعہ تمہیں دیکھیں گے۔" اماں وزیراں کے کہنے پر وہ کمرے میں آگئی۔ اور پھر حلیہ قدرے ٹھیک کرکے اماں کے ساتھ ہی زارون کے بیڈ روم میں گئی تھی۔

"بس اب یہ سکون سے سوئے گا۔ اسے ڈسٹرب مت کیجئے گا ایک طویل اور بھرپور نیند اس کے لیے بہت ضروری ہے۔" وہ غالباً "انجکشن لگا کر بیٹے تھے۔

"ارے واہ اماں! آپ تو ہمیں بس چائے کے کپ پر ہی ٹرخانا چاہتی ہیں جبکہ ہم تو ناشتے کی آس میں بھوکے ہی چلے آئے ہیں۔" انہوں نے ہنستے ہوئے اماں سے کہا جبکہ نظریں ان کے عقب میں کھڑی ثانیہ پر جا رکی تھیں۔

"یہ ثانیہ ہے۔" ہارون نے فوراً ہی تعارف کروایا۔

"ماشاء اللہ! زارون تو ہم سے بھی زیادہ خوش قسمت نکلا۔" انہوں نے پلٹ کر ہارون سے کہا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیے۔

"علی کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔" ہارون نے ثانیہ سے کہتے ہوئے علی کے جملے کی وضاحت کی۔

"ویسے ثانیہ بھابھی! اس گھر میں میرا ایک دوست رہتا ہے ہارون گردیزی۔ اس کی کوئی خیر خبر ہے آپ کو؟" اپنا سامان باکس میں رکھتے ہوئے علی نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا تو وہ حیرت سے ہارون کو دیکھنے لگی جو علی کی بات پر زیر لب مسکرا رہے تھے۔

اب وہ بھلا اس بات کا کیا جواب دیتی کہ جس کا پوچھ رہے تھے وہ سامنے ہی تو بیٹھا تھا۔

"مانا کہ دوست بن کر ہم سے ملنا انہیں گوارا نہیں مگر مریض بن کر ہمارے پاس آنے میں تو کوئی قباحت نہیں۔"

"میں آنا چاہ رہا تھا مگر وقت ہی نہیں مل سکا۔" ہارون نے فوراً وضاحت کی۔

"صاحب! وقت تو ہر انسان کے پاس ایک جیسا ہی ہوتا ہے یعنی چوبیس گھنٹے' اور اپنے لیے وقت ملتا نہیں نکالنا پڑتا ہے۔ ہاں یہ اور بات کہ تم نے زندگی کے ہر ضروری اور غیر ضروری معاملات میں اپنی ذات کو سب سے آخر میں رکھ چھوڑا ہے۔ اینڈ دس از ناٹ فیئر ہارون۔ انسانی زندگی اتنی ارزاں نہیں ہوتی شاید تمہیں احساس نہ ہو مگر بہرحال تمہاری ذات بہت سے لوگوں کے لیے بہت اہم ہے۔" ڈاکٹر علی کی بات پر ثانیہ نے ہارون کو دیکھا۔ ان کی بے ترتیب سانسوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان کی طبیعت کس حد تک خراب ہو چکی ہے۔ اس پر رات بھر جاگنے کی وجہ سے آنکھوں کی سرخی بے تحاشا بڑھ گئی تھی۔ وہ ابھی تک رات کے ملگجے سے شلوار سوٹ میں تھے جس کے کف الٹے ہوئے تھے اور گریبان کے چند بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ثانیہ نے کبھی انہیں اس بے ترتیب حلیے میں نہیں دیکھا تھا۔

"چلیے ذرا اپنے بیڈ روم میں۔ لگے ہاتھوں آپ کا چیک اپ بھی ہو جائے۔" ڈاکٹر علی نے ہارون کو اٹھنے کا اشارا کیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

"ویسے میرا خیال ہے اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔ لیکن لڑکی ثانیہ بھابھی جیسی کیوٹ ہونی چاہیے۔" وہ کہتے کہتے باہر نکل گئے تھے۔ ہارون بھی ست قدموں سے ان کے ساتھ ہو لیے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ثانیہ زارون کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

وہی معصومیت تھی' وہی بے خبری مگر شگفتگی کا

137

کہیں نام و نشان نہ تھا۔ رات کی بے پناہ اذیت کے آثار چہرے پر نمایاں تھے۔ سپید رنگت میں زردی غالب آگئی تھی۔ ثانیہ نے بھیگا تولیہ لے کر بہت آہستگی سے اس کے چہرے پر پھیرا۔ نچلے ہونٹ پر خون کی پپڑی سی جم گئی تھی اسے بہت نرمی سے صاف کرنے کے بعد اس نے دوبارہ مرہم لگادیا تھا۔ زارون ذرا سا کسمساتے ہوئے کراہا تھا۔ وہ ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگی۔ مگر وہ دوبارہ بے سدھ ہو چکا تھا۔ ثانیہ غیرارادی طور پر اسے دیکھے گئی۔

"انسان تین روز بخار میں رہے تو اس کے سارے گناہ بخش دیے جاتے ہیں اور یہ جو اتنے سالوں سے اس کرب میں ہے تو کانچ کے پیکر میں ڈھل گیا ہوگا۔"
ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں سوچ ابھری تھی۔
اب پھر بھی سکون سے سو رہا ہے مگر رات کس قدر اذیت اور درد سہا ہے اس نے۔ لیکن جب آنکھ کھولے گا تو پہلے کی طرح ہنستا مسکراتا ہوگا۔ نہ اپنی قسمت کو برا بھلا کہے گا نہ اپنی تکلیف پر خدا سے شکوہ کناں ہوگا۔
تو پھر ایسے معصوم اور پیارے انسان سے گریز اور اجتناب کیسے برتا جاسکتا ہے؟ اس سے نفرت کیونکر کی جاسکتی ہے؟
اگر میں خفا ہوں' ناراض ہوں تو کس سے اور کیوں؟
خدا نے میری قسمت میں یہ ہی کچھ لکھا ہے تو میں اس فرشتہ صفت انسان سے کس چیز کا بدلہ لے رہی ہوں؟
اس نے زارون کا بدن سرد ہوتے محسوس کیا تو اٹھ کر کمبل اسے اوڑھا دیا۔
"مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا زارون گریزی کہ میں تمہیں اس نفرت میں حصہ دار بناؤں جو اس معاشرے سے مجھے حاصل ہوئی ہے۔ تم تو محبت کے قابل ہو۔ صرف محبت کے' ایک خالص' سچی اور کھری محبت ہی تمہارا اصل حق ہے کیونکہ تم خود ایسے ہو۔ بے غرض اور پاکیزہ محبت تم پر لٹائی جاسکتی ہے زارون اور میں ایسا کروں گی۔ کسی صلے کی تمنا کیے بغیر۔"
زارون کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس نے عہد کیا تھا اور پھر قدرے جھک کر اپنے کپکپاتے ہونٹ زارون کی سرد پیشانی پر رکھ دیے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس دورے کے بعد زارون کئی دن تک مضمحل اور نڈھال سا رہا تھا اس لیے اس کے لیے میل نرس کا بندوبست کردیا گیا تھا مگر اس کے باوجود وہ زارون کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہ ہوئی تھی۔
ادھر ہارون کے چار روزہ بخار نے اماں وزیراں کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔
"پہلے دن ہی دوا لے لی ہوتی تو اب تک بھلا چنگا ہوگیا ہوتا۔ اب دیکھو ذرا اتا سامنہ نکل آیا ہے۔ چار دن سے اپنا کوئی ہوش ہی نہیں۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے یوں بستر پر پڑے دیکھ کر مگر یہاں پروا کس کو ہے؟" وہ سوپ بناتے ہوئے نم آلود آواز میں بول رہی تھیں۔
جب سے زارون کے ساتھ یہ سب ہوا تھا' بخار خواہ کیسا بھی معمولی کیوں نہ ہو یونہی دہلا کر رکھ دیتا تھا۔
اسی لیے تو جب ان کا منیجر چند ضروری کاغذات پر سائن کروانے گھر آیا تو اماں اس سے بری طرح الجھ گئی تھیں۔ منیجر بے چارہ بے بھاؤ کی سننے پر گڑبڑا کر رہ گیا تھا۔ اور جب یہ اطلاع بذریعہ فون ہارون تک پہنچی تو وہ الٹا اماں وزیراں پر بگڑنے لگے۔ وہ بھی کان دبائے چپ چاپ سنتی رہیں اور جب ہارون کا سارا غصہ نکل گیا تو کمرے سے باہر آتے ہوئے اماں نے نہایت اطمینان سے کہہ ڈالا تھا۔
"ہارون میاں! وہ منیجر دوبارہ یہاں آیا تو میں تب بھی اس کے ساتھ یہی سلوک کروں گی۔ تم نے جو کرنا ہو کرلینا۔" ان کے اس واضح اعلان کے بعد ہارون نے اور تو کیا کرنا تھا طبیعت بحال ہوتے ہی آفس کی طرف چل دیے تاکہ منیجر کے دوبارہ گھر آنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

♥ ♡ ♡ ♥

"فار گاڈ سیک زارون! ابھی آپ جائیں یہاں سے۔ میں نے بتایا ناں کہ میں ایک ضروری کام سے جارہا ہوں۔ آپ کو فی الحال ساتھ نہیں لے جاسکتا۔" ہارون کی بے حد جھنجلائی ہوئی آواز کانوں سے ٹکرائی تو ان کے کمرے کے سامنے سے گزرتی ہوئی ثانیہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔

"نئیں بھائیان! میں جاؤں گا آپ کے ساتھ۔" زارون نے ضدی لہجے میں کہا۔ ثانیہ نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا' ہارون نے لاکر میں سے کاغذات نکالتے ہوئے قدرے خفگی سے زارون کو دیکھا تھا اور پھر جیسے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے بولے تھے۔

"زارون بیٹا! آپ صبح میرے ساتھ چلنا ہاں۔ آئس کریم بھی کھائیں گے اور شاپنگ بھی کریں گے۔ ٹھیک ہے نا؟" انہوں نے کاغذات بیڈ پر پھیلا کر یونہی سرسری نگاہوں سے دیکھے اور پھر انہیں فائل میں لگا کر دروازے کی طرف بڑھے مگر زارون نے عقب سے ان کا بازو دبوچ لیا تھا۔

"میں ابھی جاؤں گا۔"

"شٹ اپ زارون۔" انہوں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا۔

"اب آپ نے مزید تنگ کیا تو میں بہت خفا ہوں گا۔ کہہ دیا ناں کہ آپ کہیں نہیں جارہے۔" ان کی ڈانٹ پر زارون سہم سا گیا تھا۔ ثانیہ کے سامنے ہارون کی پشت تھی سو وہ زارون کو دیکھ تو نہیں پائی تھی مگر اسے معلوم تھا اس وقت اس کی کیا حالت ہو سکتی ہے۔

"آپ آرام سے گھر میں بیٹھیں۔ مووی دیکھیں یا۔۔۔"

"ہارون صاحب۔۔۔! آپ۔۔۔ آپ پلیز زارون کو اس طرح سے مت ڈانٹیے۔" وہ انگلی اٹھا کر زارون کو تنبیہی انداز میں کہہ رہے تھے جب ثانیہ نے انہیں ٹوک دیا۔

"تو اور کس طرح سے ڈانٹوں؟" انہوں نے قدرے ناراض ہوتے ہوئے ثانیہ کو دیکھا جس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں تھے۔

"پچھلے بیس منٹ سے مسلسل ضد کررہا ہے کہ میں اسے اپنے ساتھ باہر لے کر جاؤں اور فی الوقت میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ وہاں آفس میں بیسیوں لوگ میرا انتظار کررہے ہیں۔ میں اسے کس طرح سے اپنے ساتھ لے جاسکتا ہوں؟" انہوں نے اپنی مجبوری ظاہر کی تھی۔

"اگر آپ ایک بار اطمینان سے اسے بات سمجھادیں گے تو وہ آپ کو بار بار تنگ نہیں کرے گا۔" ثانیہ نے گویا ان ہی کی بات ان کو لوٹائی تھی اور وہ لب بھینچ کر گلاسز کے پیچھے سے بس اسے گھور کر رہ گئے تھے۔ تو گویا اب یہ انہیں بتائے گی کہ زارون کو کس طرح ٹریٹ کیا جانا چاہیے۔

"مجھے معلوم ہے میری اس گستاخی پر آپ کو غصہ آئے گا' لیکن اگر آپ زارون کو اس طرح ڈانٹیں گے تو میں خاموش نہیں رہ سکوں گی۔" انہوں نے ناک پر پھسل آنے والے گلاسز کو شہادت کی انگلی سے ٹھیک کرتے ہوئے بغور اسے دیکھا' جس کے چہرے پر غصے کی ہلکی سی سرخی تھی اور جو سر جھکائے بڑے احترام سے ان کی کلاس لے رہی تھی۔

"زارون کا مینٹل لیول کیا ہے اس بارے میں آپ سے زیادہ اور کون جانتا ہے۔ وہ اتنی سمجھ بوجھ نہیں رکھتا کہ آپ کے ماتھے پر پڑی تیوریوں کو دیکھ کر ساری بات سمجھ جائے۔ اس کو تو بہت سہولت اور آرام سے ایک بات سمجھانی پڑتی ہے۔ اس کے باوجود آپ اسے ایسے ڈانٹ رہے ہیں جیسے وہ کوئی بچہ ہو۔ ٹھیک ہے وہ ایک نارمل انسان نہیں مگر اس کی ذات اتنی ہی عزت و احترام کی متقاضی ہے جتنی کہ ہم سب کی۔" کوئی اور وقت ہوتا اور ثانیہ کے بجائے کوئی اور ان کے سامنے کھڑا ہوتا تو شاید اب تک وہ اسے کس کے تھپڑ رسید کرچکے ہوتے۔ مگر اب نجانے کیوں ان کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی جسے چھپانے کے لیے انہوں نے سر جھکالیا مگر بدستور مسکراتے رہے۔

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

"اور۔۔۔ اور یوں بھی اگر ملازمین نے زارون کے ساتھ آپ کا یہ سلوک دیکھا تو شاید وہ بھی۔۔۔ مجھے امید ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گے مگر۔۔۔" اسے غالباً" احساس ہوا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ بول گئی ہے اس لیے ایک دم ہی خاموش ہو گئی تھی۔

"آؤ زارون! ہم چلتے ہیں اپنے کمرے میں۔" وہ زارون کا ہاتھ پکڑ کر باہر چلی گئی تھی اور اس کے جانے کے بعد وہ کھل کر مسکرا دیے تھے۔

"ویٹس لائیک آ گڈ گرل۔ یہ ہی تو وہ رویہ ہے جس کی میں تم سے خواہش رکھتا تھا۔ انسان اسی وقت اپنی چیز کی حفاظت کرتا ہے جب اس کے دل میں اس چیز کی ملکیت کا احساس جاگے۔ تم زارون کے لیے میرے مقابل آکھڑی ہوئیں۔ آئم تھینک فل ٹو یو اینڈ تھینک گاڈ۔" مسکراہٹ خوشی کے احساس کی صورت ان کے چہرے پر نمایاں تھی۔ وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکلے اور سامنے سے آتی اماں کو روک کر کہنے لگے۔

"ثانیہ اور زارون سے کہیے وہ تیار ہو جائیں۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم لوگ باہر گھومنے جا رہے ہیں۔"

♥ ♡ ♡ ♥

وہ سو کر اٹھی تو آخیر اکتوبر کی سرمئی شام موسم کی تمامتر خوبصورتی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھی۔ سیاہ بادلوں سے ڈھکا آسمان جیسے برس جانے کو تیار تھا۔ ہوائیں سرشار ہو کر درختوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ اس نے کھڑکی سے ایک نظر باہر کے موسم کا جائزہ لیا اور پھر نہانے چلی گئی۔

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بال سلجھاتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کا دل بننے سنورنے کو چاہا تھا۔ موسم کی خوبصورتی کا اثر غالباً" دل پر بھی ہوا تھا۔ اس نے نہایت جھجکتے ہوئے ڈیپ ریڈ کلر کی لپ اسٹک اٹھا کر ہونٹوں پر لگائی تو وہ اپنے چہرے پہ بہت اجنبی سی لگی۔ شادی والے دن کے بعد سے غالباً" اس نے پہلی مرتبہ میک اپ کی کسی چیز کو ہاتھ لگایا تھا۔ مگر آئینے میں اپنا آپ اتنا عجیب سا لگا کہ اس نے دوبارہ کسی چیز کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

"اور پھر فائدہ بھی کیا ہے؟ کس کے لیے یہ بننا سنورنا؟ ان سیاہ آنکھوں میں میرے لیے ستائش ابھرے گی نہ حسن کو سمیٹ لینے کی بے پناہ خواہش۔ وہ تو مجھے بھی ان ہی نظروں سے دیکھتا ہے جن سے اماں وزیراں کو، دنو بابا کو یا بارون کو۔"

وہ گلاس ونڈو سے پرے برستی پھوار کو دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے خود پر ترس آیا تھا۔ من میں کوئی بے نام سی خواہش انگڑائیاں لینے لگی تھیں۔ وہ ست روی سے چلتے ہوئے باہر لان میں آ گئی۔ بارش کے باریک قطرے موتیوں کی صورت اس کے بالوں میں اٹکنے لگے تھے۔

"ثانیہ! ثانیہ!" زارون اسے پکارتا ہوا اس تک آیا تو وہ اپنی سوچوں کو انتہائی فضول قرار دیتے ہوئے سر جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ نجانے کب سے لان میں گھوم رہا تھا۔ اسی لیے کافی حد تک بھیگ گیا تھا۔

"ارے۔۔۔ یہ کیا؟" اس کے نزدیک آ کر وہ جس طرح ٹھٹھکا تھا اور جس حیرت سے اس کے ہونٹوں کی طرف اشارا کیا تھا، ثانیہ بری طرح جھینپ گئی تھی۔

"کچھ نہیں۔" اس نے ٹالا اور اس کی طرف سے رخ موڑ کر گلاب کا پھول توڑنے لگی۔

"یہ کس لیے توڑ رہی ہو؟" اس نے ثانیہ کے کندھے پر سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے لیے۔" ثانیہ نے ٹہنی پر سے اضافی پتے اور کانٹے اتارتے ہوئے پھول اس کی طرف بڑھا دیا۔

"میرے لیے۔" اس کی آنکھوں سے مسرت آمیز استعجاب چھلکا تھا۔ پھول ہاتھ میں لے کر وہ بھرپور انداز میں مسکرا دیا تھا۔

"ہوں۔" ثانیہ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ پھول سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے لگا۔

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

"کیا دیکھ رہے ہو؟" ثانیہ کو اس کا انداز عجیب سا لگا تھا۔

"ثانیہ تم۔۔۔" وہ دو قدم آگے بڑھ آیا تھا۔

"تم بہت اچھی ہو۔"

"بہت اچھی ہو۔" وہ غالباً" اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔ ثانیہ نے قدرے الجھ کر دیکھا تو وہ ایک بار پھر ہنس دیا۔

"تم سچ مچ بہت اچھی ہو۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر انگلی کی پوروں سے اس کے ہونٹوں کو نزاکت سے چھو کر گویا رنگ کو محسوس کرنا چاہا تھا۔ اس کا انداز بہت معصوم، بہت بے ضرر تھا مگر آنکھیں۔۔۔

"تم اسے اپنی محبت دو اور پھر اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھنا اس کی آنکھیں تمہیں اس محبت کا جواب دیتی ہوئی محسوس ہوں گی۔" ہارون کی آواز سماعتوں میں گونجی تھی۔ وہ بس اک پل ہی اس کی سیاہ آنکھوں میں دیکھ پائی تھی۔ دل ایک بار پوری قوت سے دھڑکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے تحاشا چمک کے ساتھ موسم کی نمی بھی اتر آئی تھی۔ دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے ایک بار پھر زارون کو دیکھا اور پھر پلٹ کر بھاگتی چلی گئی۔ اس کے پیچھے لان میں تنہا کھڑا زارون بارش میں بھیگتے ہوئے اپنی شفاف آنکھوں سے کبھی ثانیہ کو دیکھ رہا تھا اور کبھی ہاتھ میں پکڑے گلاب کو۔

"تم بہت اچھی ہو ثانیہ۔" گلاس ونڈو میں کھڑی ثانیہ نے اپنی بے ترتیب سانسوں کو ہموار کرتے ہوئے زارون کو بڑبڑاتے دیکھا تھا اور پھر کھڑکی سے سر نکال کر کھل کے مسکرا دی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

جس شخص نے صدیوں پیاس کا ذائقہ چکھا ہو، اسے سیراب ہونے کے لیے سمندر بھر پانی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ قطرے میں ہی قلزم تلاش کرتا ہے۔ ثانیہ بھی زارون کی ذرا سی توجہ پا کر ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔

زارون اسے اہم جاننے لگا تھا۔ اسے ان لوگوں پر فوقیت دینے لگا تھا جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے آئے تھے۔ وہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہی بے تکی سی باتیں جن کا نہ سر ہوتا تھا نہ پیر۔ معنی و مطالب سے عاری باتیں۔

مگر ثانیہ کو ان باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔

اسے کوفت محسوس ہوتی تھی نہ بیزاری۔

اس روز وہ اسٹڈی روم میں کچھ کتابیں دیکھ کر باہر نکلی تو اماں وزیراں لاؤنج میں صوفے پر اونگھ رہی تھیں۔

"اماں! زارون کدھر ہے؟" اس نے وہیں ریلنگ پر جھکے جھکے پوچھا۔

"معلوم نہیں بیٹی! شاید باہر لان میں ہے۔"

"ذرا دیکھیے تو۔۔۔ صبح سے صرف دودھ پی رکھا ہے۔ دوپہر کے کھانے میں تو ابھی وقت ہے۔ میرا خیال ہے، میں اس کے لیے فروٹ چاٹ بنا دیتی ہوں۔ آپ پلیز اسے بلا لائیے۔"

"اچھا بیٹی۔" وہ اٹھ کر لان میں آگئیں۔ وہاں زارون مالی سے کہہ کر رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ بنا رہا تھا۔

"لیکن بیٹا! اس کا کیا کرو گے؟" مالی بابا نے گلدستہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے پوچھا۔

"ثانیہ کو دوں گا۔" اس کے فوری جواب پر مالی بابا اور اماں بے اختیار ہنس دیے تھے۔

"ماشاءاللہ بڑی ہی نیک دل بچی ہے۔ بڑے حوصلے اور صبر والی۔ زارون میاں کا تو بہت خیال رکھتی ہے۔" اماں وزیراں کے دل میں ثانیہ کے لیے محبت کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"بس آپا وزیراں! اللہ جس کے دل میں چاہے رحم ڈال دے ورنہ کیا بچی کا دل نہیں چاہتا ہوگا کہ زارون میاں بھلے چنگے ہوتے۔ اس کے دکھ سکھ کے ساجھی ہوتے۔ اس کے لیے کما کر لاتے مگر آفرین ہے بھئی انسانیت کا حق ادا کر دیا ثانیہ بی بی نے۔۔۔" مالی بابا کے لہجے میں ثانیہ کے لیے ستائش تھی۔ اماں وزیراں بھی

ان کی ہاں میں ہاں ملاتی واپس آ گئیں۔

"اماں! ثانیہ کہاں ہے؟" زارون اپنے بیڈ روم سے باہر آ رہا تھا۔

"وہ اسٹڈی روم میں ہیں بیٹا۔" اماں نے بتایا تو وہ دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ اماں کچن میں آ گئیں اور وہاں ثانیہ کو مصروف دیکھ کر سر پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

"ہائے لو۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تم یہاں ہو گی۔ زارون بے چارہ تمہیں ڈھونڈنے اوپر گیا ہے۔ جاؤ تم ذرا اس کی بات سن لو۔" انہوں نے چھری اور سیب اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"ثانیہ___ ثانیہ___!" وہ سنک میں ہاتھ دھو رہی تھی جب زارون نے اسے زور زور سے آوازیں دینا شروع کر دیں۔

"آ رہی ہوں بھئی۔" وہ فوراً ہی کچن کے دروازے تک آئی۔

"ثانیہ۔" وہ گلدستہ سامنے کرتے ہوئے جھکا تھا۔

"ارے___ یہ کہاں سے لیا؟" وہ پرمسرت حیرت کے ساتھ آگے بڑھی۔

"یہ میں نے تمہارے لیے___" وہ کہتے ہوئے سیڑھیاں اترنے کے لیے آگے بڑھا اور پھر ایک دم ٹھٹھک گیا۔ آنکھیں جھپک جھپک کر ثانیہ کو دیکھا اور پھر پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے کے بعد دوبارہ رک گیا۔

"ثانیہ!" اس کی آواز میں گھبراہٹ سی تھی۔

"کیا بات ہے زارون؟" دوپٹے کے پلو سے ہاتھ خشک کرتی ثانیہ چونک گئی۔

اس کی ہوشیار نظروں نے اتنے فاصلے سے بھی زارون کے بے رنگ ہوتے چہرے کو جانچ لیا تھا۔ زارون کی سپاٹ نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر جم گئی تھیں اور ان سے جھلکتا ہر تاثر لحظہ بہ لحظہ غائب ہوتا چلا جا رہا تھا۔

"زارون___ زارون کیا ہو رہا ہے تمہیں؟" وہ اس کی طرف لپکی تھی اس کی آواز پر زارون لحظہ بھر کے لیے روہانسے انداز میں چلایا تھا۔

"ثانیہ___! ثانیہ___!" زارون کے جسم نے ہلکی سی جھرجھری لی تھی۔ ثانیہ بجلی کی سی تیزی سے درمیانی فاصلہ عبور کرتی سیڑھیوں تک پہنچی تھی مگر پھر بھی اسے دیر ہو چکی تھی۔ زارون کے جسم نے زور سے دو چار جھٹکے کھائے تھے اور اگلے ہی لمحے وہ لہراتا ہوا سیڑھیوں پر گرا تھا اور لڑھکتا چلا گیا تھا۔ زارون کے ساتھ ساتھ ثانیہ کی فلک شگاف چیخوں نے گویا گھر کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"زارون___ زارون___" اس نے متوحش ہو کر آخری سیڑھی پر ساکت و صامت پڑے زارون کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

"ہائے میں مر گئی___" زارون کے سر سے بھل بھل بہتے سرخ خون کو دیکھ کر اماں وزیراں نے اپنا آپ پیٹ لیا تھا۔

"اماں___! یہ کیا ہو گیا___؟ اماں___! کچھ کرو___ کسی کو بلاؤ___ زارون___!"

اس کے سر سے بہتے خون کو اپنے دوپٹے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ پاگلوں کی طرح چیخی تھی۔ اس کا رنگ دھلے لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ ہونٹ بے رنگ ہو گئے تھے۔ اماں وزیراں نے رو پیٹ کر گھر کے ملازمین کو اکٹھا کر لیا تھا۔

"ہارون صاحب کو فون کریں۔ بی بی! ہارون صاحب کو بلائیں۔" نجانے کس ملازم نے اپنے ہوش کھوتی ثانیہ کو جھنجھوڑا تھا۔ اماں نے فوراً آگے بڑھ کر زارون کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ اپنی چیخوں کا گلا گھونٹتی فون کی طرف لپکی۔

"نمبر___ نمبر بتاؤ۔ ہارون کا نمبر کیا ہے___؟" ریسیور ہاتھ میں لے کر وہ بے دم ہوتی ہوئی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی تھی۔ دتو بابا نے نجانے کہاں سے ڈھونڈ کر اس کے سامنے ایک کارڈ رکھ دیا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو رگڑتے ہوئے نمبر پڑھا۔ بے تحاشا گھبراہٹ اور اچانک پڑنے والی افتاد نے اسے اس طرح ہراساں کیا ہوا تھا کہ بے جان

انگلیاں بٹن پریس کرنے میں بھی ناکام ہو رہی تھیں۔

"لایئے بی بی! میں ملاتا ہوں۔" کسی ملازم نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ وہ ریسیور اس کے ہاتھ میں دے کر خود دوبارہ زارون کی طرف بھاگی تھی۔ جسے صوفے پر لٹا دیا گیا تھا۔ بہتے خون نے اس کے چہرے اور شرٹ کو بھی لال کر ڈالا تھا۔

اماں وزیراں اس پر جھکی دوپٹے سے اس کا چہرہ پونچھ رہی تھیں۔ دینو بابا متواتر پانی کے چھینٹے منہ پر ڈال رہے تھے مگر اس کے وجود میں ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی تھی۔

"پیچھے ہٹ جائیں۔ پیچھے ہٹ جائیں۔" کسی اجنبی نے اچانک ہی دھاوا بول دیا تھا۔ اماں اور ثانیہ کو پیچھے ہٹاتے ہوئے ملازم کی مدد سے زارون کو اٹھا کر باہر کھڑی گاڑی میں ڈالا۔

"میں ساتھ جا رہا ہوں بی بی! ہارون صاحب کو بتایئے گا ڈاکٹر علی کے ہاسپٹل میں لے جا رہے ہیں۔" نہایت عجلت میں اطلاع دیتا ہوا یہ اشرف تھا جس نے بروقت اپنی عقل کا استعمال کرتے ہوئے ساتھ والے گھر سے مراد صاحب کو بلایا تھا۔

"میں بھی ساتھ جاؤں گی۔" وہ ننگے پاؤں پیچھے بھاگی تھی کہ دینو بابا نے اسے تھام لیا۔

"ثانیہ بیٹی! ہارون میاں کا انتظار کرلیں۔" وہ ان کی بات سنے بغیر باہر لپکی تھی مگر تب تک گاڑی فل اسپیڈ سے گیٹ کراس کر چکی تھی۔

"اماں!" اس نے انجانے خدشوں سے نڈھال ہوتے ہوئے اماں کے کندھے پر سر رکھا تو پھر پھوٹ پھوٹ کر روتی چلی گئی۔

ہارون گاڑی تیزی سے گھر کی طرف بھگائے جا رہا تھا۔ جب مراد صاحب کی کال اس نے موبائل پر ریسیو کی اور پھر گھر جانے کے بجائے راستے ہی سے اس نے گاڑی کا رخ ڈاکٹر علی کے ہاسپٹل کی طرف موڑ دیا تھا۔ ان کے اندرونی اضطراب کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا کہ جب وہ کئی سگنل توڑ کر ہاسپٹل تک پہنچے تو ایک گاڑی سے ٹکر ہونے کے بعد ان کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس ٹوٹ چکی تھیں۔ اشرف اور مراد صاحب انہیں کوریڈور میں ہی مل گئے تھے۔ ڈاکٹر علی کی بدولت تمام کارروائی مکمل کر کے زارون کو آئی سی یو میں لے جایا جا چکا تھا۔

بند دروازے کے پیچھے معلوم نہیں کیا ہو رہا تھا۔ وہ اپنی پیشانی مسلتے ہوئے وہیں بینچ پر ٹک گئے تھے۔ ان کا دل جیسے ایک جگہ ٹھہر سا گیا تھا۔ ذہن ایک دم خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ ہاسپٹل کا سرد سا ماحول ان کے اعصاب کو منجمد کئے دے رہا تھا۔

تقریباً ڈھائی، تین گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد ڈاکٹر علی نے ڈاکٹر بختیار کے آفس میں قدم رکھا تو ہارون برق رفتاری سے اٹھ کر ان کے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر علی کا چہرہ اترا ہوا تھا اور انہوں نے ہارون کو دیکھتے ہی نظر چرالی تھی۔

"علی ــــ! زارون ــــ؟" ان کی آنکھوں میں بے شمار سوال ابھرے تھے۔

ہزارہا اندیشوں میں امید کا ٹمٹماتا ہوا چراغ، ان کی آنکھ میں روشن تھا۔ ڈاکٹر علی خاموشی سے ان کے پاس سے گزرے اور پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگالیا۔

"علی! میں تم سے زارون کا پوچھ رہا ہوں۔" انہوں نے تڑپ کر علی کا بازو پکڑ کر اپنی طرف گھمایا تھا۔ ڈاکٹر علی چند لمحے ان کے چہرے پر امید اور ناامیدی کے یکساں تاثرات کو دیکھتے رہے اور پھر دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ہم چاہنے کے باوجود اسے نہیں بچا سکے۔" علی نے بہت ہولے سے پھونک مار کر اس ٹمٹماتے چراغ کو بجھایا تھا جس کے بعد اندھیرا یکلخت ہی بڑھ گیا تھا۔

"علی ــــ!" ہارون کا ہاتھ ان کے پہلو میں گر گیا تھا۔ اور دھڑکنیں یقینی و بے یقینی کے درمیان پتھر ہو گئی تھیں۔

"صاحب ــ صاحب ــــ! زارون بھائی ہمیں چھوڑ گئے ــــ" اشرف نجانے کدھر سے آیا تھا اور روتے ہوئے ان کے وجود سے لپٹ گیا تھا۔ وہ ایک دم لڑکھڑا کر کرسی پر گر گئے تھے۔

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

"حوصلہ میرے یار۔۔۔!" علی فوراً آگے بڑھ آئے تھے۔

"اللہ کے معاملات میں کون دخل دے سکتا ہے۔"

"جو خدا کو منظور۔" ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں انہیں دلاسا دے رہا تھا۔ انہوں نے کرسی کے ہتھوں کو سختی سے دبوچ کر خود پر ضبط کرنا چاہا مگر زارون کا ہنستا کھلکھلاتا، روشن چہرہ ان کی نگاہوں کے سامنے آکر ٹھہر گیا تھا اور آنسو ایک لکیر کی صورت ان کی بے یقین آنکھوں سے بہتے چلے گئے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

ثانیہ کتنی ہی دیر سے آخری سیڑھی پر بیٹھی تھی اور اس کی منتظر نگاہیں کبھی دروازے پر جا ٹکتیں کبھی فون پر۔ اماں وزیراں جائے نماز سنبھالے بیٹھی تھیں۔ پورے گھر میں عجیب سی خاموشی پھیلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بے چین دل کے ساتھ اٹھ کر کچھ دیر ادھر ادھر چکراتی رہی پھر کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔

اماں نے تسبیح کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں تو وہ بے چینی سے کہہ اٹھی۔

"ہارون صاحب کو فون کر دینا چاہیے تھا۔" اماں نے اس کی بات سن کر اثبات میں سر ہلایا مگر خاموش رہیں اور اسی خاموشی کے دوران دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ دونوں بری طرح چونکی تھیں۔

"ارے۔۔۔۔ کیسا ہے میرا بچہ؟" اماں وزیراں، ہارون اور ان کے پیچھے ڈاکٹر علی کا چہرہ دیکھ کر ان کی طرف لپکی تھیں۔ ثانیہ نے خود میں کرسی سے اٹھنے کی ہمت نہ پائی تھی۔ ہارون کا ستا ہوا چہرہ۔ بے تحاشا سرخ ہوتی آنکھیں۔ لرزتے کانپتے ہونٹ۔ انہوں نے بغیر کچھ کہے سب کچھ کہہ ڈالا تھا۔

"ہائے میں مر گئی۔ میرا بچہ۔۔۔!" اماں نے گیٹ سے اندر آتی ایمبولینس دیکھ کر اپنے سینے پر دو ہتڑ مارے تھے۔ ثانیہ گم صم سے انداز میں انہیں دیکھتی رہی۔

"ثانیہ! ہم لٹ گئے۔ برباد ہو گئے۔" ان کا بوڑھا دل اس غم سے پھٹا جا رہا تھا۔

"ہمارا کھلونا ہم سے چھن گیا ثانیہ! ہم خالی ہاتھ رہ گئے۔" اماں نے ثانیہ کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اس کی کلائیوں میں بھری چوڑیوں کو توڑ ڈالا تھا۔ اس کی ہونٹوں سے لپ اسٹک رگڑ ڈالی۔ جب وہ سہاگن بن کر اس گھر میں آئی تھی تو کوئی رسم نہ ہوئی تھی اور اب سہاگ لٹ گیا تھا تو سب ہی رسمیں نبھائی جا رہی تھیں۔ اس کے اندر باہر ٹھنڈی ٹھار برف گرنے لگی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ اٹھی تھی اور بے خود سے انداز میں چلتی ہوئی سیڑھیوں کے پاس جا رکی تھی۔ یہاں سے وہاں تک ہر رنگ کے پھول بکھرے پڑے تھے۔

"یہ پھول زارون میرے لیے لایا تھا۔" وہ آہستگی سے بڑبڑائی تھی اور ایک ایک پھول اٹھا کر، ایک ایک بکھری ہوئی پتی کو چوم کر اپنے خون آلود آنچل میں رکھتی جا رہی تھی۔

خون بھی اسی کا تھا اور تحفہ بھی۔

وہ ڈگمگاتے قدموں سے چلتی ہوئی باہر لان میں آگئی جہاں زارون کی میت رکھی جا چکی تھی۔ اسے آتے دیکھ کر کسی نے چہرے سے سفید چادر ہٹا دی تھی۔

نور کے ہالے میں چاند بے خبر تھا۔

اس نے ذرا سا جھک کر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھاما اور ایک ٹک اسے دیکھے گئی۔

وہ ازلی معصومیت کے ساتھ ابدی نیند سو رہا تھا۔ ماورائی خوشبو میں لپٹا وجود۔۔۔۔

"ان ہونٹوں نے آخری بار مجھے پکارا تھا۔ ان آنکھوں نے آخری بار مجھے دیکھا تھا۔ ان ہاتھوں میں آخری تحفہ میرے نام کا تھا۔" وہ اس کے ایک ایک نقش کو دیکھتی رہی۔ پھر آنچل میں سمٹے پھول اس پر نچھاور کیے اور پھر لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی۔

"ثانیہ! تم بہت اچھی ہو۔" اس کے تعاقب میں آتی آواز ہولے ہولے اس کے دروازے پر دستک

145

دیتی رہی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اور پھر...... نجانے کتنا وقت بیت گیا' زارون کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ غم کا وہ پہاڑ جس کے بوجھ تلے ان کا خیال تھا کہ بس چند ہی لمحے وہ مزید جی سکیں گے' وقت کے تیشے نے ذرہ ذرہ اس پہاڑ کو سرکا دیا تھا اور وہ سب ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے تھے' زندگی بتانے کو کہ جو گھاؤ تھے انہیں تو اب تا عمر اپنے سینے میں بسائے رکھنا تھا۔ انہیں اس دل سے دربدر کرنے کی سکت تھی نہ خواہش۔ سو رفتہ رفتہ سب کچھ اپنے معمول پر آتا چلا گیا مگر ایک واضح تغیر کے ساتھ۔ ہارون آفس جانے لگے تھے مگر اتنی خاموشی سے کہ ان کی آمد کی خبر ہوتی نہ روانگی کی۔ اماں وزیراں کی ہمہ وقت نم رہنے والی آنکھیں خشک ہو گئی تھیں مگر اٹھتے بیٹھتے ایک آہ ان کے لبوں سے نکلتی رہتی تھی۔

ثانیہ جو طویل عرصے تک اپنے کمرے میں بند رہی تھی' اب رات کے کسی پہر عقبی لان میں ٹہلتی نظر آنے لگی تھی۔

اس تمام عرصے میں تائی اماں اسے دوبار اپنے ساتھ لے جانے آئی تھیں' مگر اس نے ان کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ جس پر تائی اماں کو غصہ آ گیا تھا۔

"اے جس کے نام پر تم یہاں آئی تھیں جب وہی نہ رہا تو تم یہاں کیا کرو گی؟ کس حیثیت میں رہو گی اس گھر میں؟"

"اس گھر میں میری حیثیت کے تعین کے لیے زارون کا نام ہی کافی ہے۔ لیکن اگر کبھی یہ دیواریں سکڑنے لگیں اور اس گھر کی زمین مجھ پر تنگ پڑ گئی تو میں کسی دارالامان میں پناہ لوں گی یا کسی فٹ پاتھ پر زندگی گزاروں مگر آپ جیسے گھٹیا' کم ظرف اور حریص لوگوں کے درمیان تب بھی نہیں آؤں گی۔" اس کے زہر خند لہجے پر انہیں پتنگے لگ گئے تھے۔ لمحے بھر میں انہوں نے اپنے احسانات کی ایک فہرست گنوا دی تھی۔

"ارے ہاتھ بھر کی تھیں تم جب تمہارا باپ مر گیا اور تمہاری طوائف ماں روتی بلکتی تمہیں لے کر اس گھر کی دہلیز پر آئی تھی۔ خود تو مر گئی تمہیں چھوڑ گئی ہماری ذمے داری پر۔ جن مصیبتوں سے میں نے تمہیں پالا' وہ میں ہی جانتی ہوں۔ اور آج ہم گھٹیا' کم ظرف ہو گئے۔ حریص ہو گئے۔"

"آپ نے مجھے پالا نہیں تھا۔ میں تو اپنے آپ پل گئی تھی۔ زمین پر کینچوے کی طرح گھسٹ گھسٹ کر۔ کسی بھکاری کی طرح کھاتے ہوؤں سے دو نوالے مانگ کر۔ کسی ملازمہ کی طرح آپ سب کی اترن پہن کر۔ اپنی خواہشوں' آرزوؤں اور تمناؤں کو مار کر میں نے اپنے ماں باپ کی غلطی کا خراج ادا کرنا چاہا مگر میرے قصور پھر بھی معاف نہیں ہوئے۔" وہ ایک دم پھٹ پڑی تھی۔ برسوں سے دبا ہوا لاوا بہہ نکلا تھا۔

"ہاں اتنا کرم ضرور کیا آپ نے کہ مجھے ایک چھت دے رکھی تھی' لیکن اس احسان کے بدلے میں کیا کچھ وصول نہیں کیا آپ نے' میری عزت نفس' میری انا' میری خودداری سب کچھ چھینا آپ نے' بیس سالوں میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں جس پر صرف اور صرف میرا نام ہو' جینا اس گھر کی ملازمہ تھی اور میں اس گھر کی فرد مگر وہ مجھ سے بہتر زندگی گزارتی تھی۔ اس کے تو کام کے اوقات مقرر تھے' اسے ہفتے میں چھٹی بھی ملتی تھی وہ اپنے کام کی اجرت وصول کرتی تھی مگر مجھے کیا ملتا تھا۔ میں چوبیس گھنٹے کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی تھی' ان بیس سالوں میں کسی شدید بیماری کے سوا مجھے آرام کا ایک دن بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اور اس ساری خدمت کے عوض مجھے کیا ملتا تھا؟ گالیاں' کوسنے' طعنے' اور اب آپ چاہتی ہیں۔ میں دوبارہ اسی جہنم میں چلی جاؤں' ایک بلینک چیک بن کر جس پر بہ وقتِ ضرورت آپ اپنی خواہش کے مطابق رقم بھر سکیں۔ نہیں' اب ایسا کچھ نہیں ہو گا جو آپ چاہیں گی۔" اس کی آواز غم و غصے کی شدت سے پھٹ گئی تھی۔ اماں وزیراں نے لپک کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ کیا کچھ بیتا تھا اس لڑکی پر مگر اس نے

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

کبھی اس بارے میں انہیں ایک لفظ نہیں بتایا تھا۔

ہارون جو یہ سب باتیں سن کر گنگ سے بیٹھے تھے' انہوں نے اماں کو اسے کمرے میں لے جانے کا اشارا کیا اور خود تائی اماں کو دوبارہ یہاں آنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔

"وہ اس گھر کی عزت ہے اور اس کے بارے میں سوچنا اب ہمارا کام ہے۔"

ہارون کا استحقاق بھرا لہجہ انہیں ایک آنکھ نہیں بھایا تھا مگر آخر کار انہیں وہاں سے ناکام واپس لوٹنا پڑا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

آسمان گزشتہ کئی روز سے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا جو نہ برستے تھے اور نہ سورج بادشاہ کو آزاد کرنے پر تیار ہوتے تھے' موسم کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اماں وزیراں سرد موسم سے گھبرا کر سرِ شام ہی اپنے کمرے میں گھس گئی تھیں۔ ثانیہ کمرے کی سپاٹ دیواروں کو تکتے تکتے اکتا گئی تو باہر نکل آئی۔ برآمدے کے نگی ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک طویل سانس لے کر آسمان کو دیکھا جو اب بھی بادلوں میں چھپا ہوا تھا اور جس کی بدولت رات کا اندھیرا مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

"میرا وجود ایک بے کنار صحرا میں ڈھل چکا ہے اور میں اپنی ہتھیلیوں پر اپنے ہی وجود کو سجائے بادِ صرصر کے حوالے کر رہی ہوں' اے پروردگار! اور تو کچھ نہیں چاہیے۔ بس چھت بھر آسمان اور آنگن بھر زمین اور تو کچھ نہیں چاہیے۔ کچھ بھی نہیں۔" خنک ہوا اس کے چہرے سے آکر ٹکرائی تھی۔ وہ ذرا سا چونک گئی۔

بوندا باندی شروع ہو چکی تھی اور لان ہلکی پھوار میں بھیگ رہا تھا۔ بارش کے ننھے ننھے قطرے درختوں کے چوڑے پتوں سے ٹکرا کر خفیف سا شور پیدا کر رہے تھے۔ اس نے ایک نظر بھیگتے ہوئے گیٹ وے پر ڈالی اور پھر برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گیٹ وے پر آگئی۔ نم آلود ہوا کی خنکی میں شدت تھی مگر اس کے باوجود بہت بھلی لگ رہی تھی۔ مٹی کی خوشبو میں رچی بسی پھولوں کی مہک کو محسوس کرتے ہوئے وہ گیٹ تک آئی تو چوکیدار بھاگ کر وہاں آیا تھا۔ اس کے اشارے پر گیٹ کھولتے ہوئے چوکیدار کے چہرے پر حیرت در آئی تھی مگر وہ بولا کچھ نہیں تھا' وہ چپ چاپ گیٹ سے باہر آگئی۔ نہ جانے کیوں ذہن و دل اس وقت آزادی کے خواہاں ہو رہے تھے۔ چار دیواری اسے کھلنے لگی تھی۔ سو وہ یونہی چپ چاپ اس طویل اور خاموش سڑک پر چلتی رہی۔ سردی کی وجہ سے لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے وہ گھروں کے شفاف دریچوں سے چھنتی روشنی کو دیکھتی رہی۔ اپنے ہی قدموں کی چاپ اور بارش کی غیر محسوس سی کن من کو سنتے ہوئے وہ چلتی رہی۔ ساحر رات نے جیسے پورے ماحول کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔

تب ہی سامنے سے ایک گاڑی آئی تھی۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی چند سیکنڈ کے لیے اس کے وجود کو

خواتین ڈائجسٹ کے شائع کردہ

چار نئے اور خوبصورت

ناول

- دل، دیا، دہلیز، رفعت سراج 600 روپے
- وہ خبطی سی دیوانی سی، آسیہ سلیم قریشی 400 روپے
- جو چلے تو جاں سے گزر گئے، ماہ ملک 150 روپے
- ساگر، دریا، بادل، بوند، رضیہ جمیل 250 روپے

قیمت پیشگی منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ سے بھجوائیں

ڈاک خرچ اور پیکنگ فری

منگوانے کا پتہ

- مکتبۂ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی
- لاہور اکیڈمی 205 سرکلر روڈ لاہور

روشنی میں نہلا گئی تھی۔ اس نے سڑک کے کنارے پر ہو کر گاڑی کو گزر جانے دیا اور خود آگے ہی آگے بڑھتی رہی تھی۔ وہ ذہنی طور پر اس قدر غیر حاضر تھی کہ عقب میں گاڑی کے رکنے، دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز کو سن ہی نہ پائی چونکی تو اس وقت جب کوئی اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا تھا۔

"آپ۔۔۔؟" اس نے گردن موڑ کر برابر چلتے ہارون کو دیکھا تو ٹھٹھک گئی۔ الیکٹرک پول کی زرد روشنی میں اس نے بغور ان کے بالوں میں اٹکے بارش کے باریک قطروں کو دیکھا تھا۔

"ثانیہ! تم یہاں کیا کر رہی ہو، اور پھر اس موسم میں؟" ثانیہ نے پلٹ کر دیکھا۔

وہ یقیناً" کافی دور نکل آئی تھی۔ اس نے کوئی جواب دیے بغیر موڑ کاٹ لیا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں نہر کے پل پر سے گزر رہے تھے، پانی کی سطح سیاہ تھی، مگر لہروں کا ہلکا ہلکا شور پر سکوت فضا پر غیر محسوس سی شکنوں کا جال بچھا رہا تھا۔

"ثانیہ! تم۔۔۔ تم۔۔۔ زارون سے محبت کرنے لگی تھیں ہے نا ؟۔" کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ہارون نے ثانیہ کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر پوچھا تھا۔

"میرا خیال ہے، ہم سب ہی اس سے محبت کرتے تھے۔"

"تمہیں اس کے جانے کا بہت دکھ ہوا نا؟" انہوں نے اس کی سیدھی اور شفاف مانگ پر نظریں جما دیں۔

"آپ اس چڑیا کی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس کی آنکھوں کے سامنے اس کا بچہ مر گیا ہو۔" اس نے رک کر ان کی آنکھوں میں دیکھا تھا جہاں ہلکی سی دھند کا پہرہ تھا، ہارون ثانیہ پر سے نظریں ہٹا کر سامنے دیکھنے لگے تھے۔

"وہ اس دنیا میں نہیں مگر ہمارے دلوں میں ہمیشہ رہے گا۔ تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟" ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے انہوں نے قدم بڑھائے تھے۔

"قسمت کبھی بھی میری سوچوں کی محتاج نہیں رہی ہارون صاحب! اسے جو کرنا ہو، وہ کر گزرتی ہے اس بات سے بے نیاز ہو کر کہ۔۔۔ میں کیا چاہتی ہوں۔۔۔؟۔"

اس کی نظریں بے اختیار ہارون کی طرف اٹھ کر جھک گئی تھیں۔ قریب سے کوئی گاڑی گزری تھی اور ثانیہ کا آخری جملہ اس شور میں دب کر رہ گیا تھا۔ وہ چلتے ہوئے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ یہاں موسم اور ہلکی بارش سے بے نیاز لوگوں کی وجہ سے کافی ہلچل اور رونق سی محسوس ہو رہی تھی۔ ہارون اسے ساتھ لے کر اندر چلے آئے، باہر کی نسبت اندر کا ماحول کافی گرم تھا۔ انہوں نے کھڑکی کے پاس والی میز سنبھال لی۔ کافی کا آرڈر دے کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اپنی ہتھیلی پر چہرہ رکھے وہ باہر کے ماحول میں پوری طرح گم تھی اس ماحول سے قطعاً" لاپروا اور بے نیاز ہو کر جس میں وہ بیٹھی تھی۔ انہوں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں باہر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

دوکانوں کے شوکیسوں اور نیون سائن سے پھوٹتی روشنی کی کرنیں گیلے فٹ پاتھ پر منعکس ہو رہی تھیں۔ جہاں ایک بوڑھی فقیر عورت دن بھر کی ریزگاری گن رہی تھی۔

"ثانیہ!" انہوں نے اچانک ہی کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے دوٹوک انداز میں اسے پکارا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"تمہیں یاد ہے، ایک بار تم نے کہا تھا۔ "میں اس گھر میں ہمیشہ کے لیے رہنے کا فیصلہ کر چکی ہوں" وہ اسے یاد دلاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رکے تھے، تب ہی ویٹر ان کے سامنے کافی کے کپ رکھنے لگا۔ چند منٹ دانستہ خاموش رہ کر انہوں نے ویٹر کو واپس جانے دیا تھا۔

"تو کیا آپ کو اس فیصلے سے اختلاف ہے؟"

"ہرگز نہیں۔۔۔ میں آج بھی تمہاری زبان سے یہی فیصلہ سننا چاہوں گا ہاں مگر یہ بھی خواہش ہے کہ اب حوالہ بدل دیا جائے۔" انہوں نے کافی کا گھونٹ

NOVELSCLUBB@GMAIL.COM
WWW.NOVELSCLUBB.COM

بھرتے ہوئے ایک نظر اسے دیکھا۔

"پہلے تم نے یہ بات زارون کے حوالے سے کہی تھی، میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا میرے حوالے سے بھی تمہارا فیصلہ یہ ہی ہو گا۔" ثانیہ نے کافی کا مگ میز پر رکھتے ہوئے اپنے بے جان ہاتھوں کو میز پر ٹکا دیا تھا۔

"تم نے اپنی تائی اماں سے کہا تھا کہ اس گھر میں تمہاری حیثیت کے تعین کے لیے زارون کا نام ہی کافی ہے۔ لیکن غالباً" لاشعوری طور پر ہی تم نے اس خدشے کا بھی اظہار کیا تھا کہ اس گھر کی زمین تم پر تنگ پڑ سکتی ہے۔ میری شدید خواہش ہے ثانیہ! کہ تم میرے نام سے اس گھر میں اپنی حیثیت کا تعین کرو۔" انہوں نے باہر تیز ہوتی بارش سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔ وہ کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔

"میں تمہیں کسی بھی خوف' اندیشے اور خدشے کے بغیر ایک خوبصورت اور روشن مستقبل کی پیش کش کر رہا ہوں ثانیہ اور چاہتا ہوں کہ اب کی بار فیصلہ تم کرو۔ قسمت کے ہر فیصلے سے بے نیاز ہو کر صرف وہ کرو جو تم چاہتی ہو۔ ثانیہ! کیا تم سن رہی ہو' میں کیا کہہ رہا ہوں؟" اس کے متوجہ نہ ہونے پر وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔

ثانیہ جواباً" کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اسے یقیناً" فیصلے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا۔ وہ بھی بل دے کر کے اس کے پیچھے چل دیے۔ ریسٹورنٹ سے باہر نکلتے ہوئے سرد ہوا کا جھونکا ثانیہ کے شال اور سوئٹر سے بے نیاز جسم سے ٹکرایا تو وہ بے اختیار جھرجھری لے کر رہ گئی تھی' جسے محسوس کرتے ہوئے ہارون نے اپنا کوٹ اتار کر اس کے کندھے پر ڈال دیا۔ وہ کسی بھی احتجاج کے بغیر کوٹ میں سمٹ گئی تھی۔ جیسمین کی دلفریب مہک نے اسے ہولے سے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

گیلے فٹ پاتھ پر زرد روشنیوں میں قدم بڑھاتے ہوئے ثانیہ اچانک رک گئی تھی۔ ہارون اپنی ہی سوچوں میں گم چند قدم آگے بڑھ گئے اور پھر پلٹ کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ اس بوڑھی فقیر عورت کے پاس جا بیٹھی تھی' کوٹ کی جیب سے استحقاق بھرے انداز میں والٹ نکال کر کھولتے ہوئے اس نے کتنے ہی سرخ و سبز نوٹ نکال کر اس بوڑھی عورت کے ہاتھ پر رکھ دیے تھے۔

"دعائیں پیسوں سے نہیں خریدی جا سکتیں' لیکن پھر بھی تم میرے لیے دعا کرنا' آج میں ایک نئے راستے پر قدم رکھ رہی ہوں۔" ہارون نے ثانیہ کو کہتے سنا اور پھر فٹ پاتھ پر جمع شدہ پانی میں قدم جماتے ہوئے چلنے لگے۔ ثانیہ بھاگ کر ان کے ساتھ آملی تھی۔ ہارون نے گردن موڑ کر دیکھا اپنے چہرے سے بارش کے قطروں کو ہٹاتے ہوئے وہ زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔

"تو گویا فیصلہ ہو چکا ہے۔" اطمینان کی ایک لہر ان کے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔

"میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں ثانیہ! لیکن مجھے یقین ہے' میں جلد ہی تم سے محبت بھی کرنے لگوں گا۔"

"ہاں۔ شاید میں بھی۔" ثانیہ کی آواز وہ بمشکل سن پائے تھے۔

"کیا کہہ رہی ہو؟ میں ٹھیک سے سن نہیں سکا۔" انہوں نے اس کی طرف قدرے جھک کر پوچھا تھا مگر وہ کچھ کہنے کے بجائے مسکراتی چلی گئی تھی۔

بارش ہلکی ہو گئی تھی۔ سیاہ بدلی کی اوٹ سے چاند نے گھڑی بھر کے لیے ان دونوں کو دیکھا تھا اور پھر سے بادل اوڑھ لیا تھا۔ اندھیری رات میں دو سائے چلے جا رہے تھے اور ان کے عقب میں دھیمی سرگوشیاں اور خوبصورت مسکراہٹ کا لمس فضا کے ماتھے پر ٹھہر سا گیا تھا۔

149